UNIVERSAL LIBRARY

OU_222696

UNIVERSAL LIBRARY

سلسلہ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ

(۱۰)

دیوانِ طباطبائی

یعنی

صوتِ تغزل ۱۹۳۳ء

مجموعہ کلام

نوابؔ حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر طباطبائی نظمؔ

ناشر

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ (محدود) حیدرآباد دکن

دفعہ اول
(۱۰۰۰)

۱۹۳۳ء
۱۳۵۱ھ

قیمت
عمار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

ادب الکاتب والشاعر

غزل

تمام دنیا کی شاعری میں مضمون پہلے مقرر ہو جاتا ہے پھر اس مضمون کے مناسب قافیے اختیار کئے جاتے ہیں۔

غزل ایک ایسی صنف شعر ایران میں ایجاد ہوئی جس میں مضمون سے پہلے قافیہ و ردیف مقرر کر لیتے ہیں پھر اسی قافیہ و ردیف کے مناسب مضامین اختیار کرتے ہیں۔

قافیہ و ردیف کہ تین یا چوسر کے پانسے ہیں چھکا بھی نکل آتا ہے پو بھی نکل آتی ہے۔

یہ دو لوحیں ہیں جن سے مضمون کا طلسم کھل جاتا ہے۔

دو میل راہیں جو مضمون کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ جو شخص پتہ کو سمجھ جاتا ہے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ نہیں تو بھٹک کر گم کردہ راہ ہو جاتا ہے۔
غزل گو قرعہ پھینکتا ہے اور اس کی قسمت کا جو سہم ہے نکل آتا ہے۔
قافیہ و ردیف دو پر پرواز ہیں جس سے کبھی غزل گو عرش تک پہنچ جاتا ہے اور خزانۂ عرش سے مضمون اڑا لاتا ہے۔ ؎

لے گئی عرش معلیٰ پہ مجھے فکر سخن
جا پڑا پر تو آئینہ زانو ہو کر

اس کے علاوہ ردیف میں محاورے کی شوخی پیدا کرنا سننے والوں کے دل کو بے چین کر دیتا ہے مرزا داغ مرحوم کو اس باب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔
(لگی ہوئی) ردیف ہے اس میں داغ نے یہ شعر نکالا ؎

جب میں نے آہ کی ہے قیامت اٹھائی ہے
آواز پر ہے شورش محشر لگی ہوئی

(کچھ بھی نہیں) ردیف ہے اس میں یہ شعر نکالا ؎

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہی دوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا گر کچھ بھی نہیں

حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ (کا) ردیف ہے اس میں زبان کا مزہ دیکھیے ؎

اٹھنا ہی اسکی بزم سے دشوار تھا مجھے
اور پھر سنبھالا لیا دل بے اختیار کا

شعر کی ان دونوں صنفوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صنف میں عروض کا ایک وزن ہونا کافی ہے جو قریب قریب موسیقی کا ایک وزن ہوتا ہے قافیہ کا ہونا نہ ہونا زبان کی ساخت پر منحصر ہے۔ اور اس جدید صنف میں وزن بھی قافیہ بھی بلکہ ردیف کا بھی ہونا ضرور ہے معنوی اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ اوس میں تسلسل ضرور ہے اور اس میں قافیہ و ردیف صورت بتائے غزل گو کو اسی طرف جانا چاہیے مثلاً محمل کا قافیہ شاعر کو نجد کی طرف لے گیا اور بسمل نے اوسے مقتل کی طرف کھینچا اس وجہ سے مسلسل غزل میں تسلسل باقی نہ رہا۔ اور تسلسل نہ ہونے سے شعر کی وہ خوبیاں جو بیان کے ساتھ مخصوص ہیں غزل سے فوت ہوگئیں مثلاً (ا) شاہزادہ رخصت مانگ رہا ہے ملکہ سے قلق نے اس مقام کو یوں ادا کیا ہے ؎

منہ سے بولی نہ کچھ وہ غنچہ دہن
پاؤں سے پر دبا لیا دامن

یعنی شرم نے منہ سے بات نہ کرنے دی تو شوق نے پاؤں کی حرکت سے کام لیا اور شرم پر غالب آ گیا (۲) ایا جیسے دو شہزادے عون و محمدؑ شہادت کے شوق میں نکلے ہیں دونوں بھائیوں نے ساتھ ہی یزید کی فوج پر حملہ کر دیا ہے تلواریں مارتے ساتھ ساتھ بڑھے چلے جا رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں دونوں کے درمیان حائل ہو گئیں - اب بھائی سے بھائی جدا ہو گیا ہے اس مقام پر دونوں کے یکایک مل جانے کو میر انیس یوں فرماتے ہیں ؎

وہ شیر سا پہنچا جو ادھر یہ ادھر آیا
جان آ گئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

یعنی قاتلوں کے نرغہ میں آ جانے سے ایک کو ایک کی صورت دیکھنے سے یاس ہو گئی تھی (۳) یا مثلاً حرؑ کی آمد میں فرماتے ہیں ؎

برچھیوں اڑتے ہے دب کے فرس نوں سے
آنکھ لڑ جاتی ہے دریا کے نگہبانوں سے

گھوڑے کا اوڑنا اور دریا کا نظر آ جانا یہ مضمون تو میر صاحب کا حد اعجاز کو پہنچ گیا ہے - اس کے علاوہ آنکھ لڑ جانے میں یہ معنی ادا کئے ہیں کہ تم نے پانی تو بند کیا ہے اب ہشیار ہو جاؤ میں آتا ہوں -

غرض مسلسل مضمون میں ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ شاعر کو

ایسے موقع بھی مل جاتے ہیں کہ وہ دو لفظوں میں بہت سے معنے اور بہت سی باتوں کو ادا کر دے۔ غزل گو کو دو مصرعوں میں ایسا میدان کہاں مل سکتا ہے۔ اب ثابت ہو گیا کہ غزل گو شعر کی اس خوبی سے محروم رہتا ہے جسے طلسم یا سحر یا اعجاز کہنا چاہیئے اس میں شک نہیں کہ ایسا سماں باندھ دینا جس میں شاعریہ جادو جگا سکے بڑے بڑے سخن سنجوں کو بھی شاذ و نادر نصیب ہوتا ہے لیکن غزل گو کے لئے تو ممکن ہی نہیں

آخر سیدھا رستہ چھوڑ کر

الٹی چال چلنے کا باعث کیا ہوا

سبب اس کا مشہور ہے کہ مبتدی اس قابل نہیں ہوتا کہ شاعرانہ مضمون سوچ کر نظم کر سکے آسانی کے لئے قافیہ و ردیف اسے بتائے جاتے ہیں۔ اب قافیہ کو ردیف کے ساتھ ربط دینے کے لئے ادھورا مختصر سا مضمون سوچنا پڑتا ہے۔ جو دو مصرعوں میں تمام ہو جائے مثلاً فرہاد و بہزاد و صیاد قافیہ ہو تو وہی کوہ کن و مصوری و صید افگنی کا مضمون سامنے آئیگا۔

محمل و بسمل و منزل قافیہ ہو تو محمل لیلٰی کی طرف اشارہ کرے گی بسمل قاتل کا پتہ بتائے گا اور منزل کے لئے تو جادہ پیش پا افتادہ ہے غزل گو کہے ہوئے مضمونوں کو بار بار کہتا ہے اور فخر اس بات پر

کرتا ہے کہ کہنہ مضامین کو ہر مرتبہ لباس نو میں ظاہر کرتا ہے۔ غزل کے ایجاد کا دوسرا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ معانی کو نئی نئی صورتوں میں دکھانے کی مشق پیدا ہو جائے۔

اس قیاس کے صحیح ہونے کا بڑا قرینہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں غزل ایجاد ہوئی ہے۔ اسی زمانہ میں فن بلاغت کی تدوین و تہذیب ہو رہی تھی۔

پہلے شیخ المعتزیہ جاحظ نے جو متوکل و معتصم عباسی کا معاصر تھا۔ البیان والتبیین کے نام سے ایک مختصر سی کتاب شائع کی جو آجتک گویا درس میں جاری ہے۔

پھر امام عبدالقاہر جرجانی نے اسرار البلاغۃ لکھ کر آنکھوں پر سے پردے اٹھا دئے اور دلائل الاعجاز کی تالیف سے قرآن کے وجوہ بلاغ کو بے نقاب کر دیا۔

انھوں نے جو موتی اور گلے تھے وہ بکھرے ہوئے تھے علامہ سکاکی نے گوہر شاہوار چن چن کر ایسی ایسی لڑیاں گوندھیں کہ فن کی تہذیب و ترتیب اس سے بہتر ہو نہیں سکتی۔

پھر بھی بعض علماء نے سکاکی پر دقیق نظر ڈال کر متن کو زیادہ متین کر دیا۔ اسکی سیکڑوں نقلیں ہوئیں اور بلاد اسلام میں جا بجا درس

ہونے لگے۔

آخر میں فاضل تفتازانی نے بذل جہد کرکے اس متن متین پر شرح میں لکھ ڈالیں اور اسکے فیض کو عام کردیا عرب سے لیکر ہندوستان و سمرقند سے لیکر جرجان تک معانی بیان کے درس جاری ہوگئے۔

اس فن کے پڑھنے سے اعجاز قرآن واضح ہوتا ہے اس سبب سے فن بلاغت جزو مذہب سمجھا گیا خاص کرکے فن بیان علما نے اس امر کی تعلیم کے لئے لکھا ہے کہ ایک معنی خاص کو متعدد طریقوں سے ادا کرنے کی صورتیں کیا کیا ہیں۔

مثلاً تشبیہ استعارہ مجاز کنایہ پھر ان میں سے ہر ایک کے اقسام گوناگوں ہیں

یعنی ایک معنی خاص کے ادا کرنے کے فن بیان میں سیکڑوں طریقے ہیں جب اس فن کی تعلیم کا رواج عالمگیر ہو رہا تھا اوسی زمانے میں غزل ایجاد ہوئی ہے یعنی جو پڑھیں اس کی مشق بھی کریں۔

سعدی کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک غزل کے مضامین ایک ہی طرح کے چلے آتے ہیں اور بار بار کہے جاتے ہیں۔

یہ سب مضامین عاشقانہ الورود ہیں اس لئے کہ فطرۃ انسانی سب میں مشترک ہے ایک ہی طرح کے ولولے ایک ہی طرح کی امنگیں

ایک ہی قسم کے جذبے سب میں پائے جاتے ہیں مضمون کہاں سے الگ الگ آئیں گے۔ طرزِ بیان کا الگ الگ ہونا البتہ ضرور ہے کلام میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ایک تو اصل مضمون دوسرا طرزِ بیان۔ ان دونوں میں اصل مضمون کسی کا مال نہیں اس لئے کہ وہ ہر شخص کا مال ہے ہاں طرزِ بیان اپنا اپنا الگ ہونا چاہیئے ورنہ سرقہ کا الزام عائد ہوگا۔

طرزِ بیان ہی وہ چیز ہے جس کے لئے علمائے اسلام نے فنِ بیان کو ایجاد کیا اور غزل گویوں نے اس مشق کو حدِ اعجاز تک پہنچا دیا۔ لکھنؤ کا ایک شاعر زنار بند جس کا سارا کلام زمانے نے شاید تلف کر دیا ایک عارفانہ مطلع غزل کا چھوڑ گیا ہے جو دلوں پر لکھا ہوا ہے اور کبھی نہیں مٹنے کا ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میرے کرمفرما نواب عبدالرحمن خاں شاطر نے اس بیت سے کیا اچھا استنباط کیا ہے ؎

بے محل پڑتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پہ سوار اے ابلق لیل و نہار

اصل مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر کام مصلحۃ و حکمۃ پر مبنی ہوتا ہے

اس مضمون کے ادا کرنے کے دو پیرایے دونوں بیتوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے۔ سرقہ کہنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس طرزِ ادا کو ترک کر دیا ہوتا

بلکہ بیدل کا یہ شعر ؎

چوں کاغذِ آتش زدہ مہمان نقابیم
طاؤس پر افشانِ چمن زار فنائیم

غالب کے اس شعر سے بہت مشابہ ہے ؎

کفِ ہر خاک بہ گردون شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

بیدل نے بے ثباتی عمر کے بیان میں کاغذ آتش زدہ کو طاؤس پر افشاں سے تشبیہ دی ہے غالب نے جوش بہار کے بیان میں اس کاغذ کو دام سے اور اس کے شعلہ کو طاؤس سے تشبیہ دی ہے دام و شکار کی نازک تفصیل نے مضمون ہی کو کچھ کا کچھ کر دیا۔ اس زمانے کے مضمون نگاروں نے غالب کے کلام سے صدہا سرقے نکالے اور شائع کیے مگر وہ خود ہی نہیں سمجھے نہ سمجھیں گے۔

غور سے دیکھیے تو اسے بھی سرقہ نہیں کہہ سکتے۔

مجھے ناصر علی کے اس مصرع سے ع

تپیدہ در آئینہ جوہر چو ذرہ در روزن

غالب کا یہ مصرع یقینی اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے ع

پرافشاں جوہر آئینہ میں جیسے ذرّے روزن میں

لیکن ذرّوں کا روزن میں پرافشاں ہونا تڑپنے سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے

جلال اسیر کے اس شعر سے بھی ؎

جنوں بمستی و ہشیاری آزمود مرا
زبسکہ محو تو بودم زمن ربود مرا

دیکھئے مرزا غالب نے کیا خوب استنباط کیا ہے جو قابل وجد کرنے کے ہے ؎

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھسے مری ہمت عالی نے مجھے

ان دو مصرعوں میں کیا کیا مضامین عالی نکل آتے ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسیر نے بھی بتمثیل کہا تھا غالب نے اس پر بھی ترقی کی خیر یہ لوگ تو بڑے مرتبے کے ہیں نواب سیّد محمد خاں رند جو حقیقت میں رند ہی تھے ان کو دیکھیے اور اس شعر کو دیکھیے ؎

میں مسافر ہوں اتر جاؤنگا پار اک دم میں
تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

اسی مضمون کو خواجہ میر درد نے اس طرح کہا تھا ؎

کرتی ہی بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

اسی امید میں کہ شاید کوئی ایسا شعر نکل آئے عمر بھر فکر غزل نہیں چھٹتی اور تمام اصناف شعر چھوٹ جاتے ہیں۔

کبھی غزل گو دو مصرعوں میں ایسا مضمون باندھ جاتا ہے کہ وہ مسلسل نظموں میں اس برجستگی کے ساتھ نہیں بندھ سکتا نظیری کا یہ شعر لوگوں کے دلوں پر لکھا اور زبانوں پر جاری ہے۔

بوی یار من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

مرزا رفیع سودا نے اس سے یہ مضمون استنباط کیا اور اساتذہ کا کلام دیکھنے سے یہی استنباط کو مقصود ہوا کرتا ہے ؎

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کوئی یہ نہ خیال کرے کہ میں سودا پر سرقہ کا الزام دھرتا ہوں ہرگز سرقہ نہیں یہ مضمون ہر ایک انسان کی فطرت میں داخل ہے جس زمانہ میں انگریزی کا مجھے شوق تھا اور گرے کی نظموں کا ترجمہ کر رہا تھا یہی مضمون ٹینی سن کے یہاں میں نے اس لباس میں دیکھا کہ "شگوفوں نے بے خودی میں اپنے عطر دانوں کا عطر لنڈھا دیا"

یہ بات وہم میں بھی نہیں آتی کہ نظیری کا یہ مضمون ٹینیسن تک پہنچا تھا

اسی مضمون کو مونس نے اس طرح باندھا ہے کہ مسدس کے ایک بند میں کربلا کی سرزمین کا ذکر کیا ہے جہاں بہار آئی ہوئی ہے۔ ع

بلبلیں پھول لئے پھرتی ہیں منقاروں میں

یہ مصرع پڑھ کر مجھ مرحوم کا یہ کہنا بھی یاد ہے کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں۔ اس کے بعد دوسرے بند میں بنی فاطمہ کے نونہالوں کا ذکر چار مصرعوں میں کیا ہے بیت یہ ہے ؎

انکی نکہت جو گذر جاتی ہے گلزاروں سے
بلبلیں پھول گرا دیتی ہیں منقاروں سے

آپ نے دیکھا کس قدر پھیلا کر اس مضمون کو مونس نے کہا کہ انہیں کہنا پڑا کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں۔

بادشاہ کے سبعہ سیارہ میں مرزا علی بہار مرحوم نے اسی مضمون کو سلام میں کیا خوب کہا ہے ؎

باغ میں مدح کی بیتیں جو مزا دیتی ہیں
ڈالیاں جھوم کے پھولونکو گرا دیتی ہیں

جس مضمون کے لئے مونس مرحوم کو مسدس کے کئی بند کہنا پڑے نظیری و سودا و بہار نے دو ہی مصرعوں میں نظم کیا ہے۔

طولانی مضمون کو مختصر کرنے کی مشق غزل گو کو ہو جاتی ہے اور

ایسا ہونا بھی چاہیئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(15) (1)

مفاعیلن چار بار

ترے جلوہ کے آگے اپنی ہستی کو فنا پایا
یہ پیغام اجل ہم نے دمِ قالوا بلیٰ پایا

کیا پائے طلب کو قطع تو دستِ دُعا پایا
خدائی بھر سے ہم نے ہاتھ کھینچا تو خدا پایا

رگِ گردن سے اقرب آسمان کے ماورا پایا
نہ پہچانا کبھی ہم نے اوسے اور بارہا پایا

نفس کو شہر خاموشاں کا ہم نے رہگرا پایا
رہِ بے نقشِ پاو کاروانِ بے درا پایا

تعلق ایک نعمت کو ہزاروں نعمتوں سے ہے
تری درگاہ سے جتنا ملا اس سے سوا پایا

تعلق ایک حسرت کو ہزاروں حسرتوں سی ہے
دل بے آرزو پایا تو سمجھو مدعا پایا
خدا اگر ہمت عالی بھی دے اور خاکساری بھی
سمجھنا چاہیے بس حاصل ارض و سما پایا
نہ اب پست و بلند دہر کو مڑ کر بھی دیکھوں گا
بہت گر پڑ کے میں نے جادہ صبر و رضا پایا
گدائی کا ملا تھا ٹھیکرا جو در سے ساقی کے
اسی کو بزم جم میں ساغر گیتی نما پایا
خوشی کیا سال نو کی غافلو اس دار فانی میں
یہ سوچو تو بھلا اک سال کھویا تم نے یا پایا
بھروسا زیست پر کچھ ہے نہ ایام جوانی پر
شرار سنگ سے دیکھا اسے رنگ حنا پایا
جسے ہو دید کی حسرت سنبھلنا اسکا مشکل ہے
کلیم اللہ نے بھی مثل نرگس کے عصا پایا
چلی ہے سل کچھ آزردہ چیں بر جبیں ہو کر
گدا کے گھر میں گیہوں آتی تھی جو اک چڑیا پایا
نہ سمجھے آبلہ پائی کو میری قافلے والے

نمک افشاں کوئی پایا بھی تو شور و را... پایا
زمینِ شعر پر اے نظم ہم بھی شب کو گزرے تھے
اٹھا لائے ہیں دامن میں سے جو کچھ پڑا پایا

(۲) (۹)

کلامِ حق ہے توریت اب مجھے یہ اعتبار آیا
غبیر موسیٰ سے جسکی دی تھی وہ ناقہ سوار آیا
وہ اس وادی کے گرم و سرد و خشک و تر کو کیا جانے
جو مثلِ باد گزرا اور مانندِ شرار آیا
مدارِ آسماں کو تنگ سمجھا میری ہمت نے
میں اک فتراک کے حلقہ میں عمر اپنی گزار آیا
تعالی اللہ اک دانہ میں یہ تفصیل مضمر تھی
کھلے گل کونپلیں پھوٹیں شگوفے نکلے بار آیا
یہاں جلوے بہت ہیں اور مہلت دید کی کم ہے
ہزار آنکھوں سے میں اس بزم میں مثلِ شرار آیا
جہاں میں چند دن مہماں ہے ہر فرد و بشر لیکن
وہ مہماں کیا ہے کر جو لیا بار مستعار آیا
زنِ دنیا نے گو غازہ کشی کی دل لبھانے کو

مگر اب بھی تو عارض پر نہ رنگ اعتبار آیا
محبت لالہ و گل کی جو تھی دل میں وہ کام آئی
پرِ طاؤس پر آخر وہی نقش و نگار... آیا
گناہوں سے نہیں مہلت درِ توبہ پہ جانے کی
پکارا کرتی ہے رحمت کوئی اُمیدوار آیا

(۱۵) ۳

جہاں کو مژدہ اس جانِ جہاں کی آمد آمد کا
قیامت مصرعِ ثانی ہے جس کے مصرعِ قد کا
ہُوئے افلاک پیدا نام جب آیا محمدؐ کا
طلسمِ عالمِ امکاں تھا یا ربِ قفلِ ابجد کا
مواعظ کے گہر عالم میں بکھرائے کو نور اسکا
ابھر آیا ہے غوطہ مار کر دریائے سرمد کا
زباں سے گو نہیں کہتے ہیں تھا انتظار اسکا
گواہی دے رہا ہے دل ہر اک قسیس و موبد کا
کسی میں ہے کہ عالم کا تسلّی دینے والا ہے
کسی انجیل میں لکھا ہوا ہے نام احمد کا

(۱) دو انگلیاں اٹھا کر رسول اللہ نے فرمایا تھا انا والساعۃ کھاتین ۱۲
(۲) لغت میں موبد اور مؤبد دونوں طرح آیا ہے ۱۲

تری رفتار میں بیشک ہے اعجاز مسیحائی
ہما بن کر فلک پر اڑ گیا سایہ ترے قد کا

براق تیز تگ جب طارم افلاک سے گزرا
تو مثل گرد رنگ اڑنے لگا چرخ زبرجد کا

تجھے معراج کی رفعت ہی فرش خاک پر حاصل
سر عرش اعلیٰ تکیہ ہے تیری مسند کا

جبھی سے عالم اسرار علم کن فکاں ہے تو
سبق روح القدس مکتب میں جب پڑھتے تھے ابجد کا

دعا مقبول ہو جاتی ہے تیرا نام لینے سے
ملا بندوں کو موقع حق تعالیٰ کی خوشامد کا

ملا اللہ اکبر کیا صلہ تیرے نواسوں کو
کہ ان کا قصر ہے یاقوت کا ان کا زمرد کا

میسر فرش تا عرش اک قدم مرکب کا ہے تیرے
مقام قاب قوسین ایک گوشہ تیری مسند کا

تعالی اللہ ہے اس شاہ کی شان کرم ایسی[١]
بھرم کھلنے نہیں پاتا منافق کی خوشامد کا

---

١ رسول اللہ منافقوں میں گھرے ہوئے تھے اور سب سے مدارا کرتے تھے ۱۲

نہ چھوڑے گا وہ جید کو اب نظم ثنا گستر
یہی وہ ہے رسول اللہ کے شہر علم بے حد کا
کہاں ہے کعب سیکھے ہم سے آئین ثنا خوانی
کہ نعت مصطفیٰ اور ذکر شمشیر مہند کا

(۱۴) (۱۴)

نظر آتا ہے ابر آسا گذرنا کوہساروں کا
کہ عالم عالم اجسام میں ہے بے قراروں کا
کیا ہے دستگیری کا جو وعدہ اسکی رحمت نے
کلیجا ہاتھ بھر کا ہو گیا امیدواروں کا
گلستاں ہو کہ خارستاں ہو دونوں جائے عبرت ہیں
یہ مقتل تیغ بازوں کا وہ مقتل تاجداروں کا
نہیں ہے شرط سجدہ کی جہت مشرق ہو یا مغرب
سمجھتا ہو اگر تو اک عبرت سب اشاروں کا
کرم ادنیٰ پہ اعلیٰ سے زیادہ ہے تعالی اللہ
گلوں سے بیشتر نشو و نما ہوتا ہے خاروں کا

لہ فتح مکہ کے روز کعب نے جو قصیدہ آنحضرت کے سامنے پڑھا تھا اس میں رسول اللہ کی نسبت سیف من سیوف الہند ... آنحضرت نے اصلاح دی کہ سیف من سیوف اللہ

نہ شوخی اے صبا کر وضع میں اب فرق آتا ہے
غبار اونچا نہ ہو جائے کہیں ہم خاکساروں کا

ضلالت میں گھرے ہیں اور علائق مانع عرفاں
شب تاریک ہے اور کاٹنا ہے کوہساروں کا

بہت جلدی کی تو نے کوس چلنے کے بجائیں
کہ میں نے ای اجل ماتم نہ دیکھا دوستداروں کا

شرار و برق کی فرصت سے کم ہے فرصت ہستی
کہ سیکھا ہے سمند عمر نے بھرنا تراروں کا

ہوا میں ان کے ذرے ہوں تو ہوں جو نامور گزرے
پتہ روئے زمیں پر تو نہیں ملتا مزاروں کا

بہانہ ڈھونڈھتی ہے اس کی رحمت تو یہ کیا جانے
گنہ ہے گردن مینا پہ واعظ بادہ خواروں کا

کہوں میں کیوں اسے عقد گہر پہنے ہوئے دیکھا
نظر آیا مجھے خورشید پر جھرمٹ ستاروں کا

کھلا ہی ہے کیا سرمہ نگاہ سرمگیں تیری
کہ اف کرتا نہیں مارا ہوا تیرے اشاروں کا

سمجھ بھی ہے کیا اے نظم ہم فرقت نصیبوں میں

یہ اس کا جاگنا راتوں کا یہ گننا ستاروں کا

(۱۹) (۵)

جفا و جور کی حد ہو گئی سمجھیں گے ہم اچھا
ستائے جاؤ تم اچھا کئے جاؤ ستم اچھا
اجل بھی دیکھ کر آفت میں کر جاتی ہے رم اچھا
بھلا کب تک چھپا لوگی یہ منہ دیکھیں گے ہم اچھا
مجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کہہ کر
کہ گرنا بار بار اچھا ہے۔ اٹھنا دم بدم اچھا
دل مضطر کو میرے چھوڑ کر مشق جفا کیسی
یہ کافر تیر کے قابل ہے یا صید حرم اچھا
چھپایا اس نے منزل کو بتایا راستہ اس نے
غبار رہ برا ٹھہرا رہا نقش قدم اچھا
رہے گبر و مسلماں منزل مقصد سے بیگانہ
ملا اس راہ میں ہنگامۂ دیر و حرم اچھا
بگڑنا قہر تیرا مہرباں ہونا ہے ایک آفت
یہ انداز کرم اچھا ہے یہ طرز ستم اچھا
نہ دیکھ انداز آئینہ میں اپنا پوچھ لے مجھ سے

زمانہ بھر سے اچھا اور ترے سر کی قسم اچھا

جواب صاف دیکر توڑنے کیوں ہو مری دل کو
مجھے لیت ولعل اچھی مجھے لاو نعم اچھا

مقام شکر ہے جو کچھ دیا جتنا دیا اس نے
مقدر میں نہیں ہرگز خیال بیش و کم اچھا

نہ کھوئی اپنی عزت کاسہ لیس اغنیا ہو کر
کبھی جام سفالیں سے نہ سمجھے جام جم اچھا

نفس دزدیدہ جانا خوابگاہوں میں حسینوں کی
نکالا سیر کا وقت اے نسیم صبح دم اچھا

کوئی پوچھے ذرا وارفتگان حسن سے اُس کے
وفا ہے یا جفا اچھی کرم ہے یا ستم اچھا

دراندازوں کو سمجھائے کوئی للہ پوچھے تو
ملال آپس کا اچھا ہے کہ یا رہنا بہم اچھا

مناتا ہے ہر اک اپنی قدح کی خیر عالم میں
سمجھتے ہیں کہ سب سے آپ اچھے اپنا دم اچھا

اگر ایسا ہی پر آشوب ہے ہنگامہ ہستی
تو پھر شہر خموشاں خوب ہے ملک عدم اچھا

(۱۵)

لحاظ اتنا ابھی تک حضرت ناصح کا باقی ہے
وہ جو کچھ حکم فرماتے ہیں کہہ دیتے ہیں ہم اچھا
نہ پایا شعر ہم نے دفتروں میں اور سب کچھ ہے
زباں اچھی مضامیں خوب ہاتھ اچھا قلم اچھا
روانی کو کلام نظم کی انصاف سے دیکھیں
تو کھل جائے کہ ہے تلوار اچھی یا قلم اچھا

(۱۶)

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق خرمن کا
لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن کا
گلستاں میں بھی کیا تم آتش افروزی کو آئے تھے
لگا ہے ہوا میں اگ اڑ کر رنگ گلشن کا
جو نازاں ہو دم آزاری پہ ہوا سکو یہ دو فقرہ
اجارہ چیونٹیوں کو مل گیا گور تہمتن کا
جنازہ جس گھڑی پہنچا لب مرقد تو ہم سمجھے
ذرا بھی فاصلہ دیکھا نہ گہوارہ سے مدفن کا
نہیں ہے کار فرما رنج و راحت کا سوا اسکے
مری آنکھوں پہ ہے سر پر شکر و شکوہ دوست دشمن کا

مسیحا و خضر کیا جانیں لذت کو شہادت کی
نہ دیکھی خون کی نالی نہ چشمہ آب آہن کا

نہ پوچھو دل فلک کے حادثہ سے کس طرح ٹوٹا
یہ شیشہ تھا نشانہ ہو گیا سنگ فلاخن کا

یہ کیا باعث کہ لب تک جان آ آ کر پلٹ جائے
اجل بھی کچھ اشارہ پا گئی اس چشم پرفن کا

خبر اس کی نہ تھی یہ بھی خلاف طبع گزرے گا
گلا کاٹا تھا ہم نے دیکھ کر انداز چتون کا

لئے جاتے ہیں کیا کیا حسرتیں ہم کوئے قاتل سے
جنازہ اٹھتے اٹھتے ہو گیا ہے سینکڑوں من کا

وہ دیکھو صف کی صف بسمل ہوئی جس کی نگاہوں نے
کوئی میری طرف منہ پھیرے اس ناوک افگن کا

گریباں میرا تیرا دیکھنا اک ہاتھ میں ہو گا
کہے دیتا ہوں میں ناصح مزاج اپنا ہے الجھن کا

کیا تو قید لیکن یاد رکھنا چارہ گر یہ بھی
کہ توڑا ہو گا چوڑی کی طرح سے طوق آہن کا

سنیں ہیں ٹھیلیں میں نے باتیں مجھ سے ناصح نے

ہوا یہ سلسلہ اپنی احادیث معنعن ۔۔ کا
وطن کا حال پوچھا اے نظمؔ تو سیل حوادث سے
ملے بجلی تو پوچھوں میں نشاں اپنی نشیمن کا

(۷) (۱۲)

تجمل دیکھ کر تیرے شہیدان محبت کا
مسیحا و خضر پڑھنے لگے کلمہ شہادت کا
مرے دل سے اگر نکلا شرارہ سوز فرقت کا
خدا معلوم ہو کیا حشر خورشید قیامت کا
مسیحا سے مداوا کیا ہو تیرے سوز فرقت کا
رہا مہر درخشاں کو بخار اور کیسی شدت کا
فرشتہ تو نہیں ہے پاکدامن ہو تو کیونکر ہو
کہ دل رکھتا ہی انساں اور دل بھی ایک آفت کا
نہ پوچھو دور گردوں میں حلاوت زندگانی کی
کہ اپنا خون پیتے ہیں مزا لے لے کے شربت کا
سلایا اس نے جب چاہا جگایا اس نے جب چاہا
ہمارے اور اس کے بیچ میں پردہ تھا غفلت کا
ذرا سن تو سہی کیا شور ہے شہر خموشاں میں

جو عاقل ہیں یہاں آکر سبق لیتے ہیں عبرت کا
شباب اس طرح سے گزرا کہ اب معلوم ہوتا ہی
وہ باتیں اک زمانہ کی ہیں قصہ ایک مدت کا
فغانِ آبشار و اشکِ ابر و گریۂ شبنم
جدھر دیکھو ادھر رونا ہی اپنی قسمت کا
جو چھپ چھپ کر نہ روؤں رازِ پنہاں وہ نہیں سکتا
کہ میرے آنسوؤں میں رنگ ہی میری طبیعت کا
نہیں ہرگز مجالِ دم زدن آئینہ خانہ میں
ہے اس محفل میں ہنگامہ دو صد آئینہ حیرت کا
دل آزاری کی عالم میں ہوا چلتی ہی اے حیدر
بگولے رقص کرتے ہیں مٹا کر نقش تربت کا

(۸) (۸)

سوا جلوہ کے تیرے اور میرے دل میں کیا ہوتا
سمجھتا اس کو بت خانہ جو نقش ما سوا ہوتا
تجھے یکتا سمجھ کر اعتبار یکتائی اٹھاتا ہوں
وگرنہ میں بتا دیتا جو کوئی دوسرا ہوتا
کسی کا ذکر کرکے اس قدر لی چٹکیاں تونے

گل خود رو چمن میں ہنستے ہنستے رو دیا ہوتا
کیا تھا جس نے زانو مسند الفقر فخری پر
نہ کیوں نقش سلیماں اس کا نقش بوریا ہوتا
نہیں اٹھ سکتا مجھ سے جنبش مژگاں کا صدمہ بھی
کہ تو نے آنکھ پھیری میں نظر سے گر گیا ہوتا
وہ برہم ہو گئے زلفیں ذرا رخ سے جو سرکائیں
خطا گر اور کچھ ہوتی نہیں معلوم کیا ہوتا
مرے باعث سے عالم میں ہوا مشہور تو ورنہ
یہ شہرے ہر جگہ ہوتے یہ چرچا جا بجا ہوتا
تھکا مارا تلاش منزل مقصد کا ہوں حیدر
قدم پر اس کے سر رکھتا جو کوئی رہنما ہوتا

(۱۷) (۹)

مٹا دی اس نے ہستی آستینوں کو اگر الٹا
عدم کا اٹھ گیا پردہ جو دامن تا کمر الٹا
نگاہ ناز آئینہ میں رکھتی ہے اثر الٹا
ادھر دیکھو قیامت ہو گئی یہ جادو اگر الٹا
بہار آئی اٹھے بادل چلے صحرا کو دیوانے

ہوئی الجھن بڑا آزار دل الٹا جگر الٹا
نہ بھولیں گی کبھی وہ خلوتیں وہ عیش کی راتیں
کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگام سحر الٹا
موذن نے اذاں مغرب کی دی صبح شب فرقت
بجائیں نوبتی نے وردیاں الٹی گجر.. الٹا
وہ بل کھا کر اٹھے ہیں قتل کرنے کو میں ڈرتا ہوں
مجھی پر کچھ نہ کچھ الزام دھر دیگی کمر الٹا
صبا کی شوخیوں پر رشک کیا مجھکو آتا ہے
کہ آنچل اس کا یوں سوتے میں بیخوف و خطر الٹا
جواب آیا نہ مرغان چمن سے میرے نالوں کا
گلے کو کس قدر پھیرا زباں کو کس قدر الٹا
وہ آئینہ جو میری آنکھ سے دیکھیں تو بتلا دوں
کلیجہ تھام لیں پلٹ کے تیر نظر الٹا
کسی نے آکے آنسو بھی نہ پونچھے ہجر کی شب میں
نسیم صبح نے منہ سے مرے دامان تر الٹا
گلی میں اس ستمگر کی نہ جائے لاش بھی میری
بہا دینا مجھے اے سیل اشک چشم تر الٹا

زباں منہ میں حریف کینہ جو کے ہے کہ بچھو ہے
نہ اک سیدھی سی بات اس کی نہ اس کا نیشتر الٹا

بہار باغ دونی ہو گئی ہے مینہ برسنے سے
نظر آنے لگا ہر ایک تھالے میں شجر الٹا

لب دریا تماشا انقلاب دہر کا دیکھو
کہ پانی دوپہر بہتا ہے سیدھا دوپہر الٹا

براق اس طرح روز و شب کی حد سے ہو گیا باہر
نظر آنے لگا مہر مبیں سیدھا قمر الٹا

جلے میں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مری نکلے
پریشاں باندھ کر گیسو دوپٹا اوڑھ کر الٹا

جو ہو سچ بات وہ انظم دو پہلو نہیں رکھتی
نظر آتا ہے یکساں رکھیے سیدھا یا کہ الٹا

(١٠) (١٩)

صواب اپنی خطا کو اپنے عیبوں کو ہنر جانا
رہے گم کردہ منزل رہزنوں کو راہ بر جانا

ہمیشہ ہمت عالی کو اپنا راہبر جانا
اسی رستے چلا جس راستہ کو پر خطر جانا

گلا گھونٹا ہے میرا تو نے کیوں او خوف رسوائی
شکست رنگ کے نغمہ کو بھی کیا شور و شر جانا

یہ میری سادگی اے عمر رفتہ میری نادانی
کہ تجھ کو ہم رکاب و ہم عناں و ہم سفر جانا

لیا ہے میں نے ملک خاکساری کو تواضع سے
اسی انداز سے جھکنے کو شمشیر کمر جانا

شعاع رنگ کو سرگم میں سمجھا ساز ہستی کی
تماشائے جہاں کو نغمہ تار نظر جانا

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دئے دیتی ہیں پروانے
انہوں نے شمع کے شعلہ کو شاید تاج زر جانا

تو اسی آبرو جو قطرہ شبنم سے بھی کم تھی
سنا جوہر شناسوں نے اسے آب گہر جانا

مصائب بھی جہان بے ثبات ایسے نظر آئے
کہ میں نے آفتاب حشر کو شمع سحر جانا

مجھے وارفتگی پر تشنہ عرفاں کا تھا دھوکا
جسے تجھ بے خبر دیکھا اوسی کو باخبر جانا

۱ سرگم کے سات سُر جس طرح ساز سے نکلتے ہیں اسی طرح شعاع [illegible] رنگ تار نظر پہ دوڑتے ہیں ۱۲

نہ کام آئی ہماری عقل تو کیا تیرے جلوہ کو
باندازِ دگر دیکھا بہ عنوانِ دگر جانا

بنایا رنج و راحت کو جو توام میرے خالق نے
انہیں دو نعمتوں کو میں نے بھی شیر و شکر جانا

خزانہ سے کہیں بڑھ کر ہے استغنا طبیعت کا
کہ پایا کم سے کم تو بیشتر سے بیشتر جانا

ضرر پہنچا نہ مجھ کو آن کر اس بھڑ کے چھتّے میں
کہ میں نے نوش کو بھی نیش بلکہ نیشتر جانا

دکھائے چاند رخساروں پہ چھلّوں نے جو گھونگر کے
منجم نے اسی کو فتنۂ دورِ قمر جانا

فنا کی منزلوں میں ساتھ کافور و کفن بھی تھا
اسے رختِ سفر سمجھا اسے گردِ سفر جانا

جہاں میں اس طرح سے اپنی زیرِ آسماں گزری
کہ اس کو رہگذر۔ اس کو غبارِ رہگذر جانا

روانی عمر کی دیکھی کبھی گردش ستاروں کی
تبسم برق کا اس کو اسے رقصِ شرر جانا

مثل ہے نظم جو سویا وہ کھویا حسبِ حال اپنے

شب قدر آج ہی تھی ہم نے یہ وقت سحر جانا

(۱۱) (۱۱)

ادائیں سادگی میں کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا
شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں
ستم کیسا کیا شرما کے ہاتھوں سے جو مل ڈالا
نہ اگلی سی محبت ہے نہ اگلی سی مروت ہے
الٰہی خیر وہ انداز ہی اب تو بدل ڈالا
تمہاری بزم میں آ کر نہ کچھ کہنے دیا ہم کو
گلا نالے نے گھونٹا منہ شکایت نے مسل ڈالا
فلک کو دیکھ کر شکوہ کریں ہم یہ ارادہ تھا
کہا جھک کر فلک نے سر اٹھایا اور کچل ڈالا
جدا ہے پاؤں سے زنجیر پتھر دور ہے سر سے
رفیقان کہن میں تفرقہ خوب اے اجل ڈالا
نہ یہ دیکھا فلک نے کون سرکش کون ہے عاجز
گیہوں کے ساتھ اس نے آسیا میں [illegible] ڈالا
شکن ماتھے پہ آئی اب بھلا کیوں رخ [illegible]

تعلی بڑھ گئی موباف جو پہلے پہل ڈالا

موذّن کی خوش آہنگی بے ہنگام تو دیکھو
شب عشرت میں ان حضرت نے ناحق کو خلل ڈالا

بنایا غیر کو اس نے نشانہ اپنے پیکاں کا
کسی نے چاہنے والے کا دل چٹکی سے مل ڈالا

علائق میں پھنسایا کیوں جلوہ گاہ قدس سے آکر
بتا اے نظمؔ آخر بھیس کیوں تو نے بدل ڈالا

(۲۰) (۱۲)

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

وہ دیکھو روند کر مدفن کسی کا — چھلاوا بن گیا توسن کسی کا
نہ کرنا منہ شکار افگن کسی کا — نہ کھنچا تسمۂ گردن کسی کا
وہ آنا پھیر کر چتون کسی کا — وہ سر پر گوشۂ دامن کسی کا
نگہ ہنگامہ برہم زن کسی کی — تبسم صاعقہ افگن کسی کا
چھری پھیریں گے یہ ابرو کسی کے — کرے گی خون یہ چتون کسی کا
اٹھے اس رہ میں صد ہا گرد ہو کر — نہ پہونچا ہاتھ تا دامن کسی کا
ستاروں کا بچھونا کہکشاں ہے — گیا ہے لوٹتا دامن کسی کا
کسی کے قصر پہ کیوں کھینچیے رشک — سرا ہے یہ نہیں مسکن کسی کا

دیا دو گز کفن گردوں نے بھی — ڈھکا جس سے نہ دو دن تن کسی کا
کوئی ہے کینہ جو اپنے لئے ہے — تجھے کیا تو نہ ہو دشمن کسی کا
نہ پوچھو فاتحہ پڑھنے کا انداز — وہ نازک تھا اور مدفن کسی کا
غبار کاروان بیخودی ہوں — نہ رہبر ہوں نہ میں رہزن کسی کا
چڑھوں میں عرش پر کیوں ہاں چکا ہے — بتا قرب رگ گردن کسی کا
گنہ کوئی کرے ملزم میں ٹھہروں — کسی سے دل نہ ہو بدظن کسی کا
درازی زلف کی ہے روز افزوں — لہو پیتی ہے یہ ناگن کسی کا
مجھے چاک قبائے گل نے مارا — یونہیں نکلا تھا پیراہن کسی کا
دکھایا میں نے آئینہ تو بولے — ستم ہے آج تو جوبن کسی کا
زوال حسن پر ہے لوچ باقی — ڈھلا سانچے میں ہے جوبن کسی کا
ہے رحمت پسند آئی جو اس کو — ہر سجدہ خم گردن کسی کا

زخود رفتہ ہی تجلی آج اے نظم
اسے کیا مل گیا خرمن کسی کا

(۱۳)

فعولن فعولن فعولن فعول

بڑے معرکے سے آیا ہوا — لہو میں ہے آنسو نہایا ہوا
گہر ہے کہ صبح بنا گوش میں — ستارہ سا جھلملایا ہوا

وہ عیار نظروں سے اوجھل بھی ہے — پھر آنکھوں میں بھی ہے سمایا ہوا

نہ پوچھ تو مجھ سے تو اے نہیں — کہ میں ہوں فلک کا ستایا ہوا

سزاوار رحمت ہوں میں اے کریم — کہ آیا ہوں تیرا بلایا ہوا

غضب کی تھی میدان محشر میں دھوپ — گناہوں کی ظلمت سے سایا ہوا

نظر بے آئی ہے زلف سیاہ — اندھیرا ہے آنکھوں میں چھایا ہوا

جنوں سر پہ جن کی طرح ہے سوار — اجل کی طرح دل پہ آیا ہوا

خوشی میں نے تیری بہر حال کی — خفا مجھ سے اپنا پرایا ہوا

رہائی خودی سے نہ ممکن ہوئی — یہ پہرا ہے کس کا بٹھایا ہوا

چمکتا ہے ایسا وہ کندن سا رنگ — کہ سونا ہو جیسے گلایا ہوا

چھیڑے گیت میں وہ اس ادا سے گلاب — کہ جاتا رہے ہوش آیا ہوا

میری نظم کا ہو دلوں پر اثر
یہ سکہ ہے اپنا بٹھایا ہوا

(۱۸) (۱۹)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

ایک سے ایک اُس قدر افگن کا احساں بڑھ گیا

تیر سے دل بڑھ گیا پھر دل سے پیکاں بڑھ گیا

لے کے مشتاقوں کو شوق بزم جاناں بڑھ گیا

مضطرب سی مضطرب حیراں سے حیراں بڑھ گیا
بڑھتے بڑھتے کس قدر طومار عصیاں بڑھ گیا
چند دفتر قصۂ خواب پریشاں بڑھ گیا
سر ندامت سے جھکانے کا بھی موقع اب نہیں
گھٹنوں گھٹنوں تھا جو پانی تا گریباں بڑھ گیا
کچھ تلاطم میں تھی خود بھی کشتی عمر رواں
دل کے کچھ پیہم دھڑکنے سی بھی طوفاں بڑھ گیا
روز کی بیداد اے چرخ اور اک عالم کی آہ
دیکھنا اک دن چراغ مہر تاباں بڑھ گیا
سامنے دونوں کے تھا میداں ہوائے وصل کا
رہ گئی پیچھے تمنا درد ہجراں بڑھ گیا
دیدۂ خورشید صبح و شام ہو جاتا ہے سرخ
کس قدر اس عہد میں آشوب دوراں بڑھ گیا
آرزو یہ تھی کہ آ جائے گلے میں تیرے ٹھیک
ایک ہی شب میں مہ نو کا گریباں بڑھ گیا
یہ تو چوکی بار بار آنکھیں سے ڈھونڈا کریں
برق سے بھی غمزۂ عمر گریزاں بڑھ گیا

نعمتِ خلت کا جب سے ذوق میرے دل کو ہے
خوانِ ابراہیم پر اک اور مہماں بڑھ گیے

تیرا شیوہ دل فریبی کا بہت مشہور تھا
جاں ستانی کا بھی اب تو ساز و ساماں بڑھ گیا

اہلِ کشتی کو مسرت ہے یہ چلی بادِ مراد
نامرادی کہہ رہی ہے اور طوفاں بڑھ گیا

ہوگا خود ساماں پیدا جا بجا کچھ دل میں جوش
شورشِ فریاد سے پرچھوں نیستاں بڑھ گیا

سچ یہ ہے جس روز بسم اللہ مکتب میں ہوئی
دودھ تیرا اس دن اے طفلِ دبستاں بڑھ گیا

تھا یہ کس کی قبر کا سبزہ کہ جس کو دیکھکر
پاؤں پھیلانے میں دامن سے گریباں بڑھ گیا

عہدِ پیری میں ہوا روشن بیانی کو فروغ
صبح ہوتے جلوۂ شمعِ فروزاں بڑھ گیا

ابن مریم ایک ہی ٹھوکر لگا کر رہ گئے
تو قدم ان سے مرا عیسیٰ دوراں بڑھ گیا

یاد ہے اے نظم مصرع ناسخِ مغفور کا

(۱۱) سو چمن آگے مرا سرو خراماں بڑھ گیا (۱۵)

ساقیا خالی نہ جائے ابر یہ آیا ہوا
ہو رہے ہیں سرخ شیشے دل ہے للچایا ہوا

داغ دل چمکا جو اس کے طالب دیدار کا
جھلملاتا ہے چراغ طور شرمایا ہوا

عاشقوں کو ڈھونڈتے پھرتی ہو کیا محشر میں بھی
دھوپ میں پھرنے سی ہے کچھ رنگ سونلایا ہوا

دل بھی ٹوٹا بلبل ناشاد کا پھولوں کے ساتھ
دامن گلچیں میں اک غنچہ ہے کمھلایا ہوا

کشمکش میں آرزوئے قتل نکلے کس طرح
مضطرب میں بھی ہوں قاتل بھی ہے گھبرایا ہوا

آج پھر ناصح وہی چلتا ہوا فقرہ کہا
بارہا کا جو کہ ہے ارشاد فرمایا ہوا

دیکھئے تسکیں اس نے اعجاز مسیحائی کیا
رہ گیا قالب میں دم ہونٹوں تلک آیا ہوا

✓ بام پر وہ جلوہ فرما ہے مقابل کون ہو

چاند کچھ ڈوب ڈوب کے نکلا بھی تو شرمایا ہوا
سرو و سنبل دیکھتے ہی خاک میں مل جائیں گے
بال یہ بکھرے ہوئے چلنا یہ اٹھلایا ہوا
ابر تو آیا بھی ساقی اور برس کر کھل گیا
میری آنکھوں میں اندھیرا رہ گیا چھایا ہوا
کل تلک منہ ڈھانک کر سوتے میں غم گھٹتا تھا نظم
آج دامانِ کفن منہ پر ہے دُہرایا ہوا

(٢١) (١٦)

بسکہ سیلاب فنا دار محن ثابت ہوا
بلبلہ پانی کا یہ چرخ کہن ثابت ہوا
نقش باطل جب خیال ما و من ثابت ہوا
دھر میں انسان آوارہ وطن ثابت ہوا
کہتی ہیں تیری نگاہیں تجھ پہ خون بے گناہ
او قدر انداز ناوک فگن ثابت ہوا
جب ہوا چلتی ہے نرگس کی جھپک جاتی ہے آنکھ
برق خاطف شعلہ رنگ چمن ثابت ہوا
منہ چھپا لینے کا ساماں ہو گیا محشر میں بھی

یوں اڑی رنگت کہ داماں کفن ثابت ہوا

رات کو یہ وہم تھا سے عارض روشن پہ نیل
صبح کو وہ نقش برگ یاسمن ثابت ہوا

سمجھے تھے دلدار و دلسوز و دلآرام اس کو حیف
دلفریب و دل ربا و دل شکن ثابت ہوا

دل میں تیرے تو لگا کر تیغ ٹھنڈک پڑ گئی
کچھ گنہ میرا نہ اے شمشیر زن ثابت ہوا

اب کے ہے فصل جنوں میں ناتوانی اس قدر
پیرہن اپنا نہ اپنا پیرہن ثابت ہوا

ہم تو جینے ہی کو سمجھے تھے کہ مشکل ہے بہت
جان دینا بھی نہایت ہی کٹھن ثابت ہوا

دوش پر بکھرے جو گیسو یہ پھڑک کر رہ گیا
دل اسیر دام زلف پر شکن ثابت ہوا

سرخ اس کافر کی پیشانی پہ قشقہ کھینچ کر
خون گردن پر تری اے برہمن ثابت ہوا

جی بچا آئے سر اس سے مر گیا جانے سی میں
مجھ میں اس میں اتحاد جان و تن ثابت ہوا

اس جہاں میں لوگ کہتے ہیں کہ تن ثابت نہیں
میں یہ کہتا ہوں کب اس عالم میں تن ثابت ہوا

سختیاں جھیلے نہ کیوں انساں دنیا کے لیے
کوہکن پر کب فریب پیرزن ثابت ہوا

شوق میں اس جلوہ گہ کے مہر عالمتاب بھی
مثل اک ذرے کے آوارہ وطن ثابت ہوا

زلف و قد کا تھا جو سودا خون ہو ہو کر بہا
دل ہمارا کشتۂ دار و رسن ثابت ہوا

جھک پڑی چہرے پہ لہرا کے جو زلف پُرشکن
شاخ سنبل کا ثمر سیب ذقن ثابت ہوا

قہر ڈھایا جب اٹھا مظلوم کے دل سے دھواں
ایک مور ناتواں بھی پیل تن ثابت ہوا

سر پہ تیشہ طرۂ خسرو کا دیتا ہے جواب
آج اے فرہاد تیرا بانکپن ثابت ہوا

وقت بد میں ہر طرف سے مشکلیں ہوتی ہیں نظم
آئینوں میں جابجا سورج گہن ثابت ہوا

ہول۔ (۱۷)

آپ کی محفل میں آکر دل مکدر لے چلا
آئینہ لایا تھا میں سد سکندر لے چلا

دیدہ تر لے چلا اشکوں کی چادر لے چلا
میں جدہر اٹھا بسان موج بستر لے چلا

دل صفِ مژگاں کی جانب سی مکدر لے چلا
میں بھی سرمہ کی طرح سے گرد لشکر لے چلا

سامری کے سحر کو پھر زندہ کرنے کے لئے
آکے مٹی تیرے قدموں کی فسونگر لے چلا

روزِ محشر میری ازخود رفتگی دیکھو ذرا
خود اسی کے سامنے شکووں کا دفتر لے چلا

نیند میں تجھ کو بھی آخر کچھ خبر ہے یا نہیں
آہو آنکھوں سے تری کاجل چرا کر لے چلا

آکے میخانہ میں ہم مستوں کو پہلے لوٹ لے
کس طرف او ابر دریا بار لشکر لے چلا

دیکھنا صبح شب عاشق اس کے گیسو کی شمیم
مٹھیاں بھر بھر کے باسی ہار عنبر لے چلا

زلف برہم ہو کے او لجھی جنگیاں ہنکل تے لیں

بوسہ مجھ سے چھین کر بُندے کا گوہر لے چلا

میں سرائے دہر میں ٹھہرا تھا مثل ابر و برق
کروٹیں دو چار ابھی لی تھیں کہ بستر لے چلا

میری پلکوں سے روانی اشک خوں کی دیکھ کر
ابر تر آ کر رگ سودا پہ نشتر لے چلا

ہم رہے محروم حسن و عشق کے دربار سے
طوق قمری لے چلی طرہ صنوبر لے چلا

بھا گئی ہم کو یہ تیری سیر چشمی اے حباب
آن کر دریا میں بھی خالی ہی ساغر لے چلا

میں تو سمجھا تھا عدم سابق بھی ہو ناحق جسے ہے
ہائے پھر ہستی کی تہمت کیوں لگا کر لے چلا

میں ہمہ تن آہ و نالہ خواب مرقد سے اٹھا
استخواں ہر ایک اپنا صور محشر لے چلا

کاروانِ گل چلا آخر ہوئی فصل بہار
سبزہ خود رو چمن سے اپنا بستر لے چلا

وقتِ آخر آشنا سا ہو گئے سب دل کے داغ
خود میں اپنی قبر پہ پھولوں کی چادر لے چلا

بوئے شگوفوں سے نکل آئی گریباں پھاڑ کر
باغ کو جوشِ جنوں جامہ سے باہر لے چلا
عفو کا خلعت گناہوں کی ندامت پر ملا
نذر دینے اشک جو لایا تھا گوہر لے چلا

(۱۸) ولہ (۲۱)

آج محشر میں بھی ہوں تشنہ تری بیداد کا
میں گلا گھونٹوں خیال آئے اگر فریاد کا
دل کو ٹکرے تو سہی ظالم ملا کر مجھ سے آنکھ
منہ ذرا دیکھوں تو میں ترکِ ستم ایجاد کا
لاش پر میری اگر آجائے وہ وعدہ خلاف
اتنا کہدینا کہ کیا کہنا تمہاری یاد... کا
جانتے ہو پوچھنے سے حالِ دل ہوتا ہے رنج
نام کیوں لیتے ہو پھر اُس خانماں برباد کا
تھا منا مجھ کو یہی ہے کوئے قاتل کی زمین
ہر قدم پر سامنا ہونے لگا افتاد کا
ظلم سہہ کر بنایا خود اسے سفاک خلق
داورِ محشر سے منہ پڑتا نہیں فریاد کا

نہر پر لہرا رہا ہوں میں بطا مے کے لئے
ڈھل گیا دن وہ تک سایہ گیا شمشاد کا

وہ جوانی کے مزے وہ جھگڑے وہ وصل و ہجر
شعبدہ یہ بھی تھا ایک اس چرخ بے بنیاد کا

عشق کا عالم نظر آتا ہے عالم ہی نیا
ہے زمیں افتاد کی اور آسماں بیداد کا

کون سنتا ہے میری فریاد اس کو دیکھ کر
پڑ گیا غل اہل محشر میں مبارک باد کا

اب نہ گلشن ہے نہ اپنے آشیانہ کا پتہ
کچھ بگولہ اٹھ کے دیتا ہے نشاں صیاد کا

میں ابھی محو سراپا تھا کہ رات آخر ہوئی
وصل کی شب میں تھا عالم سایۂ شمشاد کا

چہرہ اترا ہی چلا جاتا ہے اس کا شرم سے
کام کرتی ہے نزاکت مانی و بہزاد کا

تیر جستہ ہوں میں غربت سے سدا اپنا وطن
جس جگہ جا مل گئی بستر ہوا آزاد کا

رہ گیا اپنا سا منہ لیکر میں شوق قتل میں

خنجر قاتل مجھے آئینہ تھا فولاد کا

ہائے کیا سہما ہوا تھا نالۂ مرغ چمن
رہ گیا بن کر چراغ اک خانۂ صیاد کا

لشکر باد بہاری اور جنوں کی کشمکش
گل کا نکلا پیرہن شانہ چھلا شمشاد کا

شیخ کو جھک ہے کہ سمجھائے مجھے شکل عروس
ذہن میں لاؤں کہاں سے باقر داماد کا

دیدۂ فتاں نے مارا ہے کوئی پرساں نہیں
اس ستم اس قہر اس اندھیر اس بیداد کا

اے فلک اس گردش بیجا سے کیا حاصل ہوا
شاد کرنا بھی تجھے آیا کسی ناشاد کا

پاس میرے تم کو تو آنا نہیں یک دم قرار
ہے تعجب دل میں رہ جانا تمہاری یاد کا

ظلم نے آخر گوارا کر لیا داغ فراق
دل پہ رکھا ہاتھ دامن چھوڑ کر جلاد کا

۱۵

ہرزہ گردی سے قدم سودی سے سر پیدا ہوا

داغ سے دل درد سے اپنا جگر پیدا ہوا
وہ کھلیں کلیاں وہ مہکے پھول وے جلدی شراب
وہ ہوا آئی وہ ساقی ابرتر پیدا ہوا
عشق کا تیرے اسی دن سے ہے میرے دل میں داغ
پرتو خورشید سے جس دن قمر پیدا ہوا
خون اسی دن سے جگر میرا ہے دل بیتاب ہے
جب حنا میں رنگ پتھر میں شرر پیدا ہوا
ہر گھڑی لپٹائے رہتا ہوں کلیجے سے اسے
دوسرا معشوق نیا یہ داغ جگر پیدا ہوا
دل کبھی آخر مرے نادرستا ہو جھوٹی ہوئی
گیسوئے پیچاں کی صحبت کا اثر پیدا ہوا
میں نہ کہتا تھا کہ گلشن میں نہیں جا میں منصور
نالۂ بلبل سے آخر درد سر پیدا ہوا
ہاتھ پھیلانے سے بے برگ کچھ حاصل نہیں
دیکھ غنچہ کی طرف مٹھی میں زر پیدا ہوا
آتش افسردہ ہی یہ آہ کس نالۂ شبگیر تو
شور محشر کر گیا ایسا شرر پیدا ہوا

مرتبہ رکھتی ہے اے زاہد سیہ کاری مری
ابر رحمت سے مراد اان تر پیدا ہوا

میری آنکھوں میں جہاں سارا تجلی زار تھا
نخل ایمن اس کو سمجھا جو شجر پیدا ہوا

آپ سے باہر ہوئے جس دم تو پایا معرفت کو
اپنا گھر چھوڑا تو اس کے دل میں گھر پیدا ہوا

میری مٹی میں نہاں ہیں مثل اخگر سوزشیں
خاک جب سر کی ذرا داغ جگر پیدا ہوا

طور خاکستر ہوا ہے قوم موسیٰ کے لئے
نا حقیقت میں جو تھے کحل البصر پیدا ہوا

ہو چکی طے راہ ہستی جھک گیا اب قد راست
شکر ہے ملک عدم کا نظم در پیدا ہوا

۱۹ ولہ ۲۰

ہم فقیروں کا ٹھکانا بھی کہیں ہو جائے گا
جام ہمدم شیشۂ مے ہمنشیں ہو جائے گا

آ کے میخانہ میں جو عزلت گزیں ہو جائے گا
دور گردوں اس کو دور ساتگیں ہو جائے گا

راستی گر چاہتا ہے کر تواضع اختیار
سیدھا اک سجدہ میں اے نقش نگیں ہو جائے گا
دل کو روشن کر اگر ہے نیش زن زنبور غم
چاندنی راتوں میں پیدا انگبیں ہو جائے گا
بار عصیاں روز لے جایا کریں گے گر ملک
دبتے دبتے آسماں آخر زمیں ہو جائے گا
لے چلی تخت رواں سے خاک مدفن میں قضا
دیدۂ مور آب سلیماں کا نگیں ہو جائے گا
پہلے اپنی بات کا پیدا تو کر لے اعتبار
پھر اگر جھوٹوں بھی کہہ دے گا یقیں ہو جائے گا
کچھ تو رہنے دے قیامت کے لئے بھی اے فلک
کیا عذاب حشر سب مجھ پہ یہیں ہو جائے گا
خود نمائی اس قدر منبر پہ واعظ خیر ہے
ناز یہ کرنے سے کیا تو نازنیں ہو جائے گا
خامہ و ذہن رسا کا روز افزوں ہے کمال
وہ تو صورت گر یہ معنی آفریں ہو جائے گا
تو ستارہ کو مرے اے پستی طالع نہ کھینچ

آسماں کا آسماں زیرِ زمیں ہو جائے گا

آنکھ میں اک رس ہے لیکن شرط ہے طرزِ نگاہ
زہر ہو جائے گا یا یہ انگبیں ہو جائے گا

کچھ دنوں نوکِ مژہ کاوش اگر کرتی رہی
نام تیرا نقشِ دل میرا نگیں ہو جائے گا

بزم میں بے تیرے پہنچائیگا ساغر چشم زخم
خطِ پیمانہ نگاہِ نکتہ بیں ہو جائے گا

بحث رندوں سے نہ کر جا جا کے واعظ اسقدر
کیا رہے گی پھر اگر ملزم کہیں ہو جائے گا

تجھ سے اٹھیگا بھلا پھولوں کے اس گہنے کا بوجھ
قدِ موزوں رشکِ شاخِ یاسمیں ہو جائے گا

پھر ذرا تم مڑ کے دیکھو تو سہی زندہ ابھی
کشتۂ تیرِ نگاہِ شرمگیں ہو جائے گا

زلف گر ہو کر پریشاں کروٹوں میں آگئی
کھا کے بل موئے کمر بھی عنبریں ہو جائے گا

دردِ دل کا نظم کو رہتا ہے رونا روز روز
جان سے بیزار اک دن ہمنشیں ہو جائے گا

۸ ۳۱

دل نے پھر وارفتۂ حسن بت پرفن کیا
اشک خوں نے پھر چراغ آرزو روشن کیا

چھوٹ کر تیر اس کی چٹکی سے یہ دیتا ہے صدا
آفریں کیا کام تو نے اے شکار افگن کیا

بوسہ لینے کا تھا کلیوں کے چٹکنے پر جو وہم
شرم سے پھر منہ اس نے جانب گلشن کیا

گھل کے کاجل نے کیا آنکھوں کو نیلوفر کا پھول
جم کے مسی نے لبوں کو غیرت سوسن کیا

شمع میں تو آج کی شب روشنی مطلق نہ تھی
تو نے آکر خانۂ تاریک کو روشن کیا

بعد مرنے کے بھی ہیں ایسا ہوں دشمن کام خلق
شمع نے گریہ نہ اک دن بھی سر مدفن کیا

ہے نگاہ یار شوق روزن دیوار یار
مثل دیوار اس نے دل میں بھی مرے روزن کیا

کون سنتا ہے فغان بلبل کی ہم نے تو ظفر
آہ کی فریاد کی نالہ کیا شیون کیا

۲۲

اس نے دکھلا کے جھلک اپنی جو دیوانہ کیا
تو نے حیرت زدہ حسن کو دیوانہ کیا
منزل دہر نہیں چھپاؤ نی چھپانے کا مقام
خاک میں مل کے یہاں نشو و نما ہوتی ہے
سارے عالم کو بنایا ہدف تیر اجل
آج گردوں نے کیا شہرۂ آفاق جسے
کم نہیں دل سے ترے زیر میں سویدا دل کا
پھیرنا آنکھ کا عشوہ نے سکھایا مجھ کو
اس کے تو سلسلہ زلف میں آواز نہیں
سادگی آگئی جس دن سے گیا عہد شباب
الحذر ظلم بہت جھک کے فلک ملتا ہے

۱۱

طور پر جا کے ادا سجدۂ شکرانہ کیا
آئینہ کو ترے جلوہ نے پریخانہ کیا
وہی عارف ہے گذر جس نے فقیرانہ کیا
سبز ہوتی کا نہ بارش نے کوئی دانہ کیا
قدر انداز نے یہ فعل حکیمانہ کیا
کل ادھر سے تخفیف احباب کا افسانہ لیا
اسکو اسپند بنایا اسے پروانہ کیا
اس میں پیدا اثر گردش پیمانہ کیا
گوش زد یار کے کس نے میرا افسانہ کیا
پھر کبھی آئینہ دیکھا نہ کبھی شانہ کیا
خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

۲۳

کھنچتے آئے گا سینہ سے جو پیکاں اپنا
اٹھ گئی کشتی مے بزم سے ہنگام سحر
اڑ کے جاتی ہے مری خاک ادھر گاہ ادھر
حشر کو دن بھی میں ہر ایک کا منہ تکتا ہوں

۱۶

پھر بچانا تجھے مشکل ہے گریباں اپنا
دن جو یہ تخت اڑا لے گئیں پریاں اپنا
کچھ پتا دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا
کوئی اب بھی نظر آتا نہیں پرساں اپنا

ہوں وہ شوریدہ کہ موجوں کی طرح دریا میں
چاک ہوتا ہے گریباں پہ گریباں اپنا

کہیں ایسا تو نہ ہو روز سیہ پیش آئے
نہ کہیں رنگ جمائے شب ہجراں اپنا

کی جو آتش کی طرح گرد کدورت پیدا
مل گیا خاک میں آخر دل سوزاں اپنا

بس کہ تحصیل ادب ادبوں سے ہے مجھ کو
ہے خرابات زمانہ میں دبستاں اپنا

دل یہ کہتا ہے کہ پھر فصل جنوں آئی ہے
خود بخود چاک ہوا ہے جو گریباں اپنا

اپنے ہی پاؤں میں چبھتے ہیں جو بوئے کانٹے
اپنے ہی سر پہ ہوا گر لیے احساں اپنا

جوش وحشت میں بھی پابند قناعت ہوں میں
اپنے دامن کو سمجھتا ہوں بیاباں اپنا

اس نے سو مرتبہ شب بھر میں سنوارے گیسو
آئینہ اس کا رہا دیدہ حیراں اپنا

روز محشر کی بھی ایذا میں اٹھاؤں گا مگر
منہ دکھانا مجھے اے شب ہجراں اپنا

سر بزانو ہوئے جب آپ میں رہتے نہیں ہم
جادۂ دشت ہے سر رشتۂ داماں اپنا

لی خبر حضرت ناصح نے بڑی دیر کے بعد
چڑھ چکا تربت مجنوں پہ گریباں اپنا

وہ زمانہ بھی زمانہ تھا عجب اے حیدر
آشیاں اپنا تھا گل اپنے گلستاں اپنا

۲۶ ۱۴

ہر ستم مجھ میں شور مچاتا تیرا
زخم دل پر ہے نمک ریز ترانہ تیرا

کبھی کہتا ہے جو بھولے سے کبھی آنا تیرا
یاد آتا ہے شب غم میں رلانا تیرا

کس کا شکوہ کروں کس کا نہ کروں شکوہ ہے
آسماں تیرا زمیں تیری زمانہ تیرا

اے فلک خبر دل آگاہ روشن ہے تیری
جانتا ہوں کہ رلائے گا ہنسانا تیرا

حوصلے رہ گئے اے فصل جوانی افسوس
ولولے دل کے سوا کم ہے زمانہ تیرا

غمزدہ درد رسیدہ ہوں میں اے شمع مزار
دل دکھاتا ہے مرا اشک بہانا تیرا

یوں نگہ پھیر لے وہ آنکھ ملا کر مجھ سے
اے اجل خوب سمجھتا ہوں بہانا تیرا

حال کھل جائیگا آنے دے بہار اے بلبل
بے اثر ہیں مرے نالے کہ ترانہ تیرا

بے مروت کوئی پھر تجھ سے ملے کیں دل سے
آج تک یاد ہے وہ دل کا دکھانا تیرا

اے جنوں سچ ہے گلا کاٹ کے مرجاتا تھا
خوب رسوا ہوئے کہنا جو نہ مانا تیرا

حسرت تیر انہیں بھی ہے جو ہیں بے پر و بال
جب سے دیکھا ہے نشانہ کو اڑانا تیرا

تیر لگتا ہے کلیجہ پہ کبھی دل پہ کبھی
ٹھیک پڑتا نہیں نشانہ پہ نشانہ تیرا

مسکرائے جو شگوفے تو بہت رویا میں
ہونٹ تیرے مجھے یاد آئے دہانا تیرا

تا کجا شرح غم و درد خدارا حیدر
ہچکیاں لگ گئیں سن سن کے فسانہ تیرا

۲۵ —— ۱۳

مژدہ اے بادہ کشو ابر بہار آ پہنچا
کوہ سے جھوم کے اٹھا لب دریا پہنچا

ہاتھ ملتے رہے سب اسکی دلآرائی پہ
نہ گریبان تلک ہاتھ کسی کا پہنچا

چاند کو دیکھ کے طالع شب تنہائی میں
میری آنکھوں میں امنڈتا ہوا دریا پہنچا

ایک خط اسنے لکھا بھی تو لکھا بات جو آ
بعد مدت کے یہ تقدیر کا لکھا پہنچا

دوستو بہر خدا چھوڑ کے مرقد میں مجھے
اس طرف بھی کوئی بھولا کوئی بسرا پہنچا

خاک مرقد میں وہ ہی جذب کہ تم سن لینا
گرتا پڑتا اسی منزل پہ مسیحا پہنچا

گوشہ گیری کو وہ اللہ نے شہرت دی ہے
کہ نہ اس کے پر پروانہ کو عنقا پہنچا

چاہتا ہی نہ رہے خواب گرانِ غفلت
دل پر اک زخم لگا زخم کو ایذا پہنچا

اس کے دربان نے کہا دیکھ کے زندان مجھے
دیکھ لینا کہ چھٹا اور یہ سیدھا پہنچا

جلوہ شاہدِ معنی ہے جو یکم دل میں
آنکھ جب بند کی تا نہ نظر جا پہنچا

شانہ گیسو میں جو الجھا تو وہ مجھ سے الجھے
لڑ گئے زلف میں بل تا نہ کو جھٹکا پہنچا

شب غم میں ملک الموت کا آنا دیکھو
شکر ہے شکر اس آفت سے چھٹکا پہنچا

مسندِ فقر کا اپنی ہے وہ رتبہ اے نظم
نہ تو قیصر اسے پہنچا نہ تو کسریٰ پہنچا

۲۶ —— ۱۱

دل کا طالب وہ ہوا جان کا خواہاں نہ ہوا
وہ ہوا درد کہ جس کا کوئی درماں نہ ہوا

قائل مہدی جو تھا دشمن ایماں نہ ہوا
ملکے کا فر کو نہ ہوا تھا مسلماں نہ ہوا

کب سرِ زلف سیہ سلسلہ جنباں نہ ہوا
حیف صد دل کہ حریفِ غم ہجراں نہ ہوا

ہم کو حاصل یہ ہوا پھونک کے خرمن اپنا
برق کہتی ہے کہ تنکے کا بھی احساں نہ ہوا

ہو گیا سانحہ اپنا بھی عجب عبرت خیز
مفت میں جان بھی دی یار پشیماں نہ ہوا

دل کا سب راز ہی عنوانِ جبیں سے ظاہر
لاکھ لاکھ اس کو چھپایا کبھی پنہاں نہ ہوا

حلقۂ دلدادگاں میں تھا گزر ناصح کا
آج اس بزم میں وہ فتنۂ دوراں نہ ہوا

ڈھا دیا دست اجل نے تو قضا نے لوٹا — کاغذ باد ہوا تخت سلیماں نہ ہوا

سارے عالم کا تو معشوق تھا اے حسن شباب — کس کا گیسو ترے ماتم میں پریشاں نہ ہوا

نہ مزاج آپ نے پوچھا تو گلہ مجھ کو نہیں — شکر کرتا ہوں کہ شرمندۂ احساں نہ ہوا

فکر پاداش نہ کچھ شرم گنہ حیف اے نظم

سر بہ زانو نہ ہوا سر بہ گریباں نہ ہوا

۲۷ — ۱۴

مختصر مرحلۂ طول امل کیا ہوگا — قطع یہ سلسلہ بے تیغ اجل کیا ہوگا

آج کچھ ہو نہیں سکتا ہے تو کل کیا ہوگا — سر پہ جب آن ہی پہنچے گی اجل کیا ہوگا

دور کر تیرگی دل کہ ابھی تک ہے وقت — ہو گئی صبح تو روشن یہ کنول کیا ہوگا

حسرت تیغ کی بس تیرے ہی آہنگ سے ہے — ورنہ بے صوت حدی رقص جمل کیا ہوگا

چاہیئے تیغ کو شہ دل وادی ایمن ہو نہ طور — جلوہ زار اس کا بھلا دشت و جبل کیا ہوگا

ہاتھ میں چوم لوں زاہد ترے پہلے یہ بتا — میری بخشش کا سبب تیرا عمل کیا ہوگا

دیکھ کر زخم جگر کو مرے کہتا ہے رقیب — جس کا یہ پھول ہو اس تیغ کا پھل کیا ہوگا

قطعہ

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ — تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

جب میں کہتا ہوں چلو ترک محبت ہی سہی — اس پہ وہ ناز سے کہتا ہے کہ چل کیا ہوگا

حسن نیت تو ہے زاہد کا سبھوں کو معلوم — دیکھنا ہے اثر حسن عمل کیا ہوگا

بیٹھے ہیں گوشۂ عزلت میں ہم اب توڑ کے پاؤں | ہاتھ منت کش ارباب دول کیا ہوگا
تلخ کامی کی حلاوت کو نہ پوچھو ہم سے | اس سے بڑھ کر مزۂ قند و عسل کیا ہوگا
بڑھتی جاتی ہے ہوس عمر ہے جوں جوں گھٹتی | اس کا انجام اب اے طول امل کیا ہوگا

نظم اک آنی و فانی ہے پھر اس سے ناظم
خالق لم یزل عز و جل کیا ہوگا

(۲۸) ——— (۱۵)

سرو کی طرح اگر بر زدہ داماں ہوتا | مثل غنچہ کے نہ میں سر بگریباں ہوتا
رشک فغفور نہ ہم رتبۂ خاقاں ہوتا | آدمی کچھ بھی نہ ہوتا مگر انساں ہوتا
کاش کے پیش نظر مجمع خوباں ہوتا | اور ان میں سے کوئی جان کا خواہاں ہوتا
مار ڈالا ہے زمانہ کی دورنگی نے مجھے | لاش پر بھی کوئی گریاں کوئی خنداں ہوتا
ہم کہاں بیٹھ کے رستے میں ترے سستا سکیں | نقش پا کوئی تو اے عمر گریزاں ہوتا
چھپ گئے گرد میں سب قافلے والے افسوس | اس طرح بھی ہے نظر سے کوئی پنہاں ہوتا
مرغ بسمل ہوں نہیں میری تڑپنے کا علاج | چاہتا ہوں کہ وہی سر وہی ساماں ہوتا
حلقے تدویر کو اک کے مسلسل رہتے | کوئی ان کا نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا
تھاہ اس عالم اجسام کی لگتی کوئی | قطرہ میں بحر تو ذرہ میں بیاباں ہوتا
اعتبارات پہ ہستی کی بنا ہے ناظم | ہم نہ ہوتے تو کہاں عالم امکاں ہوتا
نور تھا سوز غم ہجراں کا مجھے اے واعظ | میں بھلا خوف سے دوزخ کے مسلماں ہوتا

دیکھ لیتا جو کسی کے یہ ستارہ کا عروج
کہکشاں سے فلک انگشت بدنداں ہوتا

تجھ کو ثابت قدم اے شمع سمجھتے جب ہم
سوزِ غم کی کوئی حد ہوتی نہ پایاں ہوتا

زاہدِ خشک تبا پھر تری کیا گت بنتی
کوئی میخوار اگر دست و گریباں ہوتا

دل کا ارمان نکلنا تو ہے مشکل اے نظم
دم نکلنا ہی کسی طرح سے آساں ہوتا

۲۹ (۱۵۱)

آنکھ پھرنے میں جو رنجش کا نہ پہلو ہوتا
مجھ کو آہوں سے زیادہ رمِ آہو ہوتا

حسرت و درد کو کچھ اور جگہ مل جاتی
کاش نکلے دل سے بھی خالی مرا پہلو ہوتا

دم نکلتا بھی تو ہم ضبط ہی کرتے غمِ عشق
نیل ڈھلتا بھی تو آنکھوں میں نہ آنسو ہوتا

ہم سمجھتے کہ کیا سیماب کو کشتہ ہم نے
اگر اپنے دلِ بیتاب پہ قابو ہوتا

پیچ گھونگر نے جو ڈالے ہیں اگر کھل جاتے
کچھ کمر سے بھی نکلتا ہوا گیسو ہوتا

اثرِ آہِ رسا دل کو ہوا ہے حاصل
پھینک دیتے بھی وہ ناوک تو ترازو ہوتا

جیسا رسوائیوں کا ہے مرے رونے پہ ہجوم
ایسا میلا بھی نہ آلہی نہ لبِ جو ہوتا

دل کا بوجھ نکلتا جو کسی نالے میں
برجِ میزاں کے لئے سنگِ ترازو ہوتا

میرے نالے جو شبِ تار کو سمٹا لاتے
صبحدم چہرۂ خورشید پہ گیسو ہوتا

نہ خطر تھی شبِ ہجراں کی سیاہی ایسی
دن نکلتا بھی تو سہما ہوا جگنو ہوتا

آئے گلزار میں صیاد کو نیند آ جاتی
شاخِ نرگس پہ جگایا ہوا جادو ہوتا

ضبط گریہ بہت آسان تھا مگر مشکل تھا
دل میں ناسور تو ناسور میں آنسو ہوتا

ہم دکھا دیتے کہ یوں دب کے نکلتا ہے چاند
بام پر سر کو جو نیوڑائے ہوئے تو ہوتا

سرمہ بھی دیدۂ فتاں میں لگاتا تھا ضرور
ساتھ آہو کے غبار رم آہو ہوتا

۱۰

ہم سے بڑھ کر کوئی مجبور نہ ہوگا اے نظم
جان دینے پہ بھی اپنا نہیں قابو ہوتا

۳۰ ۱۸

جلوہ گر آنکھ میں بھی دل میں بھی پنہاں دیکھا
دیکھا دیکھا تجھے او فتنۂ دوراں دیکھا

دل کے آئینہ میں ہم نے رخ جاناں دیکھا
طور پر آپ نے کیا موسیِ عمراں دیکھا

زیست میں چار طرف مرگ کا طوفاں دیکھا
تند آندھی میں چراغ تہِ داماں دیکھا

تھم نہ پایا نہ قدم طولِ امل کے ہاتھوں
کالے کوسوں پہ مسافر نے شبستاں دیکھا

رشک ہے مجھ کو تری جامہ دری پر اے صبح
جس طرف ہاتھ بڑھا اپنا گریباں دیکھا

پاؤں سے مور ملخ کے جو اٹھی گرد ذرا
میں نے اسمیں بخدا تختِ سلیماں دیکھا

دیکھا نشتر کوئی کاری تو زبانِ منت
دیکھا پتھر کوئی بھاری تو وہ احساں دیکھا

عالمِ وجد میں کھینچا تھا ابھی دامنِ یار
آگیا ہوش تو اپنا ہی گریباں دیکھا

نعل بھر آنے کو بہانہ ہے ذرا سا کافی
رو دیے بزم میں شیشہ کو جو گریاں دیکھا

ہم نہ کہتے تھے کہ یہ جلوہ گری خوب نہیں
سحر کو رات کا سا ہے شمع فروزاں دیکھا

جھوٹ ہے جھوٹ نہ جلسے تھے کبھی اور نہ شباب
سچ تو یہ ہے کہ جب خواب پریشاں دیکھا

قسمت دہر میں لکھی ہوئی ہے ویرانی
میں نے ہر خاک کے ذرہ میں بیاباں دیکھا

جانے والوں میں ادہر کو تو سبھی تھے لیکن
سب کے آگے تجھے اے عمر گریزاں دیکھا

توسن مارے پہ ٹھہرا ہو جو رہا چھوڑ کے راہ
تو نے اے سرو چمن کس کو خراماں دیکھا

عکس عارض سے کسی کے یہ ہوا جوش صفا
آب آئینہ سے اٹھتے ہوئے طوفاں دیکھا

یہ نہیں جانتا کیا ہجر میں گذری مجھ پر
آنکھ کھولی تو طبیبوں کو ہراساں دیکھا

قہر تھا پائے نگاریں کا وہ ٹھوکر لینا
فتنۂ حشر کو بھی خون میں غلطاں دیکھا

کشتنی تھا کہ نہ تھا نظم نہ معلوم مگر
قتل کے بعد ستمگر کو پشیماں دیکھا

۳۱ ——— ۱۲

الفت میں بس دو ہی بیک دل آیا
مثل آواز جرس کے میں دو منزل آیا

قیس نے دیکھ لیا جب کہ کسے لیلیٰ کا جمال
بید مجنون جو نظر صورت محمل آیا

لطف افسوس سے اپنے ہی زمانے کو سرو
اس غم آباد میں میں مثل چلا جل آیا

نگہ شوق نے یہ پردہ دری کیسی کی
آخر اس شوخ کو غصہ سر محفل آیا

برق ... کہیں ہے روش عمر رواں
جس نے اک سانس لی وہ سینکڑوں منزل آیا

مثل سبزہ کے نہ سرسبز ہوا نام مرا
مثل دانہ کے نہ جیتے تک تہ گل آیا

... کہ جگر میں سالے دل میں
کب نظر موج ہوا کا کوئی ساحل آیا

کشتگی عمر زباں رک گئی چلتے چلتے
رشتہ شمع نظر جادہ منزل آیا

نیم جاں چھوڑ دیا مجھ کو تماشا دیکھو
رحمِ جلاد کو کیسا دمِ بسمل آیا

جان دے کر بھی نہ افسردہ ہوئی اہلِ کرم
ملک الموت کو سمجھے کوئی سائل آیا

نہ کسی جن کا گذر ہے نہ پری کا شتا
تجھ پہ کوئی نہیں آیا ہی میرا دل آیا

خاکساری طلبوں کیلئے رفعت ہے عجب
دوشِ احباب پہ میں گور کی منزل آیا

سات پردوں کو جو آنکھوں کے اُٹھایا نظمؔ
مجھ میں اور اس میں نہ پردہ کوئی حائل آیا

۳۴ (۱۱)

زندگی کیا ہے اک افسانہ کا دہرا جانا
موت کہتے ہیں کسے زیست سے اُکتا جانا

یاد ہے بزمِ مسرت میں ترا آجانا
جلوۂ حسن سے وہ شمع کا شرما جانا

منتقم قلزمِ ہستی میں ہا تارِ نفس
ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا جانا

کبھی آنے نہ دیا خاطرِ نازک پہ ملال
مجھ سے دیکھا نہ گیا پھول کا کمہلا جانا

دل ہے دل اُس کا تحمل ہے تحمل اس کا
کوہ کو جس نے پرِ کاہ سے ہلکا جانا

ہم کو عبرت نہیں اس بے خبری پر اپنی
کہ طلسمات دو عالم کو تماشا جانا

نہیں معلوم کہاں آئے کہاں جانا ہے
ایسا آنا ہی نہ اچھا تھا نہ ایسا جانا

آشیانہ کے سزاوار نہ تھا پیکرِ خاک
طائرِ روح نے اک شب کا بسیرا جانا

میں نے ہر ذرہ کی آغوش میں صحرا دیکھا
میں نے ہر قطرہ کو جولانگہِ دریا جانا

جنبشِ بادِ بہاری نے نکالی یہ چھیڑ
برق کو ابر کے آغوش میں تڑپا جانا

کس سے پوچھا تھا پتہ کس نے بتایا اے نظمؔ
کس طرح آپ نے میخانہ کا رستہ جانا

۳۴ —— ول —— ۱۱

تنِ خاکی میں ہے افسردہ مرا دل ایسا | کوئی دانہ ہوا کبھی نہ تہِ گل ایسا
کون ہے اپنے ہوا خواہوں کا قاتل ایسا | شکل تو چاند سی ہے آپ کی اور دل ایسا
بھر گیا پھولوں سے دامانِ نظر جیبِ سماع | اس قدر کثرتِ گل شورِ عنادل ایسا
گور میں بھی نہیں طوفانِ حوادث سے مفر | موج تو ایسی بلا خیز ہے ساحل ایسا
میں سمجھتا ہوں کہ شادی کا سرانجام ہے کیا | مل رہے ہیں کفِ افسوس جلاجل ایسا
عفو فرمائے جو ناصح تو میں اتنا پوچھوں | اس نے دیکھا ہے کوئی حور شمائل ایسا
بخش دے خلد کا گلزار وہ ایسا ہے کریم | اک گناہ کی پرسش کرے عادل ایسا
تیز رو جب تجھے اے ناقۂ لیلیٰ سمجھیں | دیکھ لے قیس اڑے پردۂ محمل ایسا
تخم باقی نہ رہا کشت جو سرسبز ہوئی | سبزہ آتے ہی گیا رُخ سے مرے تل ایسا
ہاتھ انگڑائیاں لے لے کے بڑھاتے ہیں جو رند | کشتیِ مے کے لئے چاہیئے ساحل ایسا

نظمؔ نے ظلم سہے اور کبھی اُف منہ سے نہ کی
ہم نے دیکھا جگر ایسا نہ کہیں دل ایسا

۳۴ —— فعلاتن فعلاتن فعلن —— ۱۱

آگیا پھر رمضاں کیا ہوگا | ہائے اے پیرِ مغاں کیا ہوگا

باغ جنت میں سماں کیا ہوگا
تو نہیں جب تو وہاں کیا ہوگا

خوش وہ ہوتا ہے مری نالوں سے
اور انداز فغاں کیا ہوگا

دور کی راہ ہے سالک میں ٹکے
اتنی مہلت ہی کہاں کیا ہوگا

دیکھ لو رنگ پریدہ کو مری
دل جلے گا تو دھواں کیا ہوگا

ہوگا اک نگہ میں جو تمام
وہ بہ حسرت نگراں کیا ہوگا

ہم نے مانا کہ ملا ملک جہاں
نہ رہے ہم تو جہاں کیا ہوگا

مرگئے جب خاک میں ملنا ٹھہرا
پھر یہ تربت کا نشاں کیا ہوگا

جسطرح دل ہوا ٹکڑے از خود
چاک اس طرح کتاں کیا ہوگا

یا ترا ذکر ہے یا نام ترا
اور پھر ورد زباں کیا ہوگا

عشق سے باز نہ آنا صدر
راز ہونے دے عیاں کیا ہوگا

۱۴ متفاعلن چار بار ۳۵

یہ ہوا آل حباب کا جو ہوا میں بھر کے ابھر گیا
کہ صدائے لطمۂ موج کی یہ غرور کدھر گیا
مجھے جذب دل سے ملے نہ جو بہک کے رکھا قدم کوئی
تجھے بے ٹھکانے شوق نے کہیں تھک کے میں جو ٹھہر گیا
مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اس قدر

کوئی جھونکا بادِ سحر کا تھا مری پاس سے جو گزر گیا
اثر اس کے عشوۂ ناز کا جو ہوا وہ کس سے بیاں کروں
مجھے تو اجل کی ہے آرزو اسے وہم ہے کہ یہ مر گیا
تجھے اے خطیبِ چمن نہیں خبر اپنے خطبۂ شوق میں
کہ کتابِ گل کا ورق ورق تری بیخودی سے بکھر گیا
کسے تو سناتا ہے ہمنشیں کہ ہے عشق دشمنِ عقل و دیں
تری کہنے کا ہے مجھے یقیں میں ترے ڈرانے سے ڈر گیا
کروں ذکر کیا میں شباب کا سنے کون قصہ یہ خواب کا
یہ وہ رات تھی کہ گذر گئی یہ وہ نشہ تھا کہ اتر گیا
دلِ ناتواں کو تکان ہو مجھے اس کی تاب نہ تھی ذرا
غمِ انتظار سے بچ گیا تھا نویدِ وصل سے مر گیا
مرے صبر و تاب کے سامنے نہ ہجومِ خوف و رجا رہا
وہ چمک کے برق رہ گئی وہ گرج کے ابر گذر گیا
مجھے بحرِ غم سے عبور کی نہیں فکر اے مرے چارہ گر
نہیں کوئی چارہ کار اب مرے سر سے آب گذر گیا
مجھے رازِ عشق کے ضبط میں جو مزہ ملا ہے نہ پوچھیے
مے و انگبیں کا یہ گھونٹ تھا کہ گلے سے میرے اتر گیا

نہیں اب جہاں میں دوستی کبھی راستے میں جو مل گئے
نہیں مطلب ایک کو ایک سے یہ ادھر چلا وہ ادھر گیا
اگر آکے غصہ نہیں رہا تو لگی تھی آگ کہ بجھ گئی
جو حسد کا جوش فزوں ہوا تو یہ زہر چڑھ کے اتر گیا
تجھے اے نظم وادیٔ شوق میں عبث احتیاط ہے اس قدر
کہیں گرتے گرتے سنبھل گیا کہیں چلتے چلتے ٹھہر گیا

۱۱ مفعلات فاعلاتن دو بار ۳۶

کہیں قابل سماعت مرا حال زار ہوتا
کہ فسانہ خوب تھا یہ اگر اختصار ہوتا
غم عشق تھا تو پھر کیوں غم روزگار ہوتا
نہ یہ جن کبھی اترتا نہ جنون سوار ہوتا
نہیں خود کو دیکھ سکتا کہ جہاں میں خود ہی یکتا
کبھی اپنے عکس سے بھی وہ نہیں دوچار ہوتا
نہیں تاب ضبط غم کی مرے مشت استخواں میں
بھڑک اٹھتا خس میں پنہاں جو ذرا شرار ہوتا
در دوست کی طلب میں مجھے کیا برا تھا مرنا
جو قدم قدم پہ ہوتا جو ہزار بار ہوتا

مجھے اس خیال پر ہیں ہے امید عفو اس سے
کہ وہ چاہتا تو ہرگز نہ میں بادہ خوار ہوتا

نہیں اعتنا کے لائق یہ وجود بے حقیقت
کہ اگر لباس ہوتا تو یہ مستعار ہوتا

میں سمجھتا مستحق ہوں نہیں سزا کا یا جزا کا
مری ہستی و بود کا بھی تو کچھ اعتبار ہوتا

اگر اپنے سوز غم کو نہ دبا دبا کے رکھتا
تو چمک کے اخگر اخگر ابھی اک شرار ہوتا

وہ مآل زندگانی جسے کہتے ہیں غم عشق
یہ اگر پہاڑ ہوتا تو نہ دل پہ بار ہوتا

دل ناوکش میں قاتل قدر افگنی کا تیری
کوئی تیر ایسا ہوتا کہ فلک کے پار ہوتا

۳۷ — مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات — ۹

جہاں میں کوئی نہ کوئی عدوئے جاں ہوگا
ہوا چمن میں نہ گل چیں باغباں ہوگا

جدھر سے قافلہ گزرے گا خاکساروں کا
سپہر ناز کش گرد کارواں ہوگا

لگا کے تیر مجھے روئے گا لہو ظالم
کہ موج خوں لیے خمیازہ کماں ہوگا

یہ آ کے دیکھ کرامات میکدہ اے شیخ
کہ ایک جام میں تو پیر سے جواں ہوگا

گلا جو کاٹ کے مر جائے تو یہ ڈر ہے / کہ سب کا اس ستم ایجاد پر گماں ہوگا

نگاہ اس نے جو پھیری تو مر مٹا دل زار / خبر نہ تھی کہ یہ ایسا مزاج داں ہوگا

لگا کے تیغ بگڑتے ہو، نہ کیجئے انصاف / تڑپ سکے گا وہ کیونکر جو ناتواں ہوگا

غضب کیا جو کسی کے خرام کو دیکھا / نہ جانتا تھا کہ دل یوں رواں دواں ہوگا

خدا کو ڈھونڈنے جاتا ہے کیا کہیں اے نظم
ہر ایک جا وہ ملیگا جو بے نشاں ہوگا

۳۸ ——— ۱٦

کہا جو تونے دل ناصبور میں نے کیا / بتا کہ تو نے کیا یا قصور میں نے کیا

بغل سے دل کو نکالا کے پھینک دیا / یہ ایک مفت کا جھگڑا اٹھا دور میں نے کیا

یہ تم کہو کہ نہ آنا یہاں نہ آؤں میں / ضرور تم نے کہا اور ضرور میں نے کیا

تمہارا ذکر ہی کیا تم کو کون کہتا ہے / فساد میں نے اٹھائے فتور میں نے کیا

کہا تھا کس نے کہ موسیٰ سے تو لڑا آنکھیں / اشارہ تجھ سے تھا اے برق طور میں نے کیا

جہاں کہیں ہو کی کثرت رہا میں آپ سے دو / جہاں ملے تجھے خلوت ظہور میں نے کیا

رہوں میں بسر گریباں یہ امر تھا دشوار / یہ سہل تھا کہ گریباں کو دور میں نے کیا

پھرا نہ موج حوادث نے لاکھ منہ پھیرا / جو بڑھا تو کاٹ کے آخر عبور میں نے کیا

لگا نہ خاک سے دامن نہ خاک دامن سے / صبا کی طرح جہاں سے مرور میں نے کیا

اب اپنے پاؤں سے پیری میں سر نہیں اٹھتا / سزا یہ اس کی ہے جیسا غرور میں نے کیا

وہ حشر میں بھی ملیں مجھ سے یہ نہیں امید
یہ اڑ کے تخت سلیماں کی خاک کہتی ہے
وہ میرے نالہ سوزاں کو کیا سمجھتے ہیں
جو دل نے منہ میں بار دی زبان میں لکنت
نگاہ شوق نے میری سکھا دی آرائش

خفا [illegible] لیے کیوں صف جمع [illegible] کیا
[illegible] اب [illegible] بال طیور [illegible] کیا
قیامت آئی اگر نفخ صور [illegible] کیا
اس [illegible] یہ کتنا [illegible] کیا
طرہ کو شانہ کشی زلف [illegible] کیا

جو مجھ سے کہتے ہیں ای نظم حسن ظن لعاب
تو میں سمجھتا ہوں کچھ کر و زور [illegible] کیا

۳۹ —————— ۱۶

ہزار آنکھیں پڑی جب فراز بام آیا
یہ کیوں کہا تھا کہ میرا نامہ کام آیا
ہماری حصہ میں جھوٹا جو اس کا جام آیا
ہر سب کو خانہ خرابی یہ سرشتہ تعمیر
جو بھول کر بھی خوشی کا گذر ہوا لیں
دیا عشق میں وہ صاحب نگیں ہوئیں
ترانہ سنج ہوائے عندلیب تیرے لئے
کلیجہ پک گیا ناصح کو منہ لگانے سے
عذاب جان مجھے ہو جاتی شام تنہائی

ہمارے حسن پہ تیرا دزیدہ [illegible] آیا
کیا سحر سے وہ ظالم تو وقت شام آیا
لب نگار [illegible] آیا
ہوا غبار ہوا و نچا تو [illegible] بام آیا
خیال موت کا لینے کو انتقام آیا
کہ یار کے لب لعلیں پہ میرا نام آیا
ہر ایک گل سے گلگونہ کا [illegible] آیا
بیٹھے بیٹھے مجھے کیا خیال خام آیا
گلے کو ساتھ بلاؤں کا اژدحام آیا

بڑا یہ حق محبت ادا کیا اس نے
کوئی جو ساتھ جنازے کے چند گام آیا

زباں کو دانتوں نے پیری میں ساتھ چھوڑ دیا
کوئی رفیق برے وقت میں نہ کام آیا

گیا ہے لینے کو اسکے مگر یقیں ہے مجھے
پیام بر کے لئے موت کا پیام آیا

گمان رقیب کا ناصح یہ ہے بجا مجھ کو
کلیجہ تھام لیا جب کسی کا نام آیا

کھلے جو بند قبا شب کو اس کے میں سمجھا
کہ صبح حشر ہوئی وقت انتقام آیا

نگاہ ہو کے پریشاں پھری ہے کاکل سے
عجب ہے یہ کہ یہ رشتہ تھا ان کے دام آیا

خدا کا خوف کرو نظم ہوش میں آؤ
کرو شراب سے توبہ مہ صیام آیا

۴۰ —————— ۱۶

بہ شہوت و غضب آلودہ دل ما را
بکعبہ طرح بنا ریختی کلیسا را

ز خویش رفتہ گرفتیم راہ صحرا را
سلام ما کہ رساند دیار سلمیٰ را

بہ بزم جلوہ برفتیم و ہمچو آئینہ
فروختیم بیک عشوہ دین و دنیا را

اگرچہ رخصت دیدار دادہ ما را
نگاہ قہر تو خوں می کند تماشا را

ہوائے ابر بفزود جوش صہبا را
شکست توبہ صدا کرد جام و مینا را

گذشت عمر و ندیدم کہ آسمان بکشود
بناخن مہ نو عقدہ ثریا را

قلیل فرصت عمر و کثیر حاصل عمر
حباب چشم کشود و بدید دریا را

غبار بام ربود ست و گرد باد ستوں
عجب کہ خانہ برانداختند صحرا را

عبور بحر معانی و دستیاری کلک — شگافتم به عصا چون کلیم دریا را
حذر ز آه فلک تاز تو دل بیمار — که شکل دار بیابد آورد مسیحا را
هزار معنی مثبت ز نفی می خیزد — که نیستی پر پروانه داد عنقا را
به جستجوی تو ام مثل دانه تسبیح — سپرده ام به سر این راه گام فرسا را
دلم گداخت چو مینا ز هول گرمی شر — ببین حرارت اندیشهائی فردا را
ستاده ام به ره شوق همچو نرگس زار — که آوریم بکف دامن مسیحا را
سراغ میکده دل گرفته ام از شان — خبر کنید حریفان باده پیما را

مخور فریب تقطر تشنه لب بمیر ای نظم
سراب آئینه دار است حال دنیا را

۴۱ ——— ۱۰

من و نگاه تو با کیف می چه کار مرا — من و بهار تو با فصل دی چه کار مرا
بغیر صور سرافیل محشر است اینجا — فغان چو خیزدم از دل به نی چه کار مرا
من و شناگری لذت جفائے حبیب — به شکوه ستم پے به پے چه کار مرا
فریب عشوه دنیا نخورده ام مخورم — بناز و غمزه بیجاش ہے چه کار مرا
ز بیخودی به گذشتم ز لامکان و مکان — به فکر هستی لاشئ و شئ چه کار مرا
بلند شد علم مهر و شبنم از جا شد — که با مسابقت ظل و فی چه کار مرا
بمن چو دوست شدی بس ضمان من تست — چنین مگو که بکر دارئے چه کار مرا

جزائے ترکِ وفا این سعدی دانست | ولے نہ گفت کہ با ملک زر چہ کار مرا

ق

بہ ظلِ معدلتِ خسروِ دکن اے نظمؔ | بہ عدل و سطوتِ کسریٰ و کے چہ کار مرا

وظیفہ ام رسد از خوانِ نعمتِ عثمان خلد اللہ ملکہ

بوصفِ حاتمِ طائی و طے چہ کار مرا

۲۴ ——— مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات ——— ۱۲

دل بارِ عشق کا متحمل نہیں ملا | سر سجدۂ نیاز کے قابل نہیں ملا

دریائے عشق میں بھی دو ہاتھ رہ گیا | موجِ ضعیف تھی مجھے ساحل نہیں ملا

کیا جانے لطفِ عشق کو بحثِ بے مزہ | ناصح تجھے دماغ ملا دل نہیں ملا

محروم ہم ہیں عید میں بھی او جفا شعار | اب بھی گلے سے خنجرِ قاتل نہیں ملا

جادہ ملا تھا رشتۂ تسبیح کی طرح | آرام مجھ کو سیکڑوں منزل نہیں ملا

گردش سے ہم بھنور میں ہیں جس طرح ہلال | کشتی اگر ملی بھی تو ساحل نہیں ملا

کہنے پہ بت کے جبر اگر یار کیا تو کیا | کس کام کا ملاپ اگر دل نہیں ملا

ابرو کا اس کے ہمسر ابرو جو بن گیا | ایسا کسی کو مدِ مقابل نہیں ملا

انساں کا دل تھا بارِ امانت کے واسطے | اس درد کا کوئی متحمل نہیں ملا

ہو کر نفس گسستہ ادا عرضِ شوق کیا | اچھا ہوا کہ قیس کو محمل نہیں ملا

اک برق تھی کہ آگ لگا کر نکل گئی | بسمل پھڑک کے رہ گئے قاتل نہیں ملا

ہے نظم تیغ جاں یہ چھری تیز رات دن
قاتل کو دوسرا کوئی بسمل نہیں ملا

یادش بخیر جلوۂ دلکش بہار کا
پشتارہ لے چلا ہوں غم روزگار کا
اونچا ہوا غبار جو اس خاکسار کا
ہو بوالہوس اور اہل جنوں کا مقابلہ
ٹپکا خون ریق کی لہریں ہے باغ میں
ہم تو بچھڑ اسطرح سے گرے پھر نہ اٹھ سکے
حاصل نہیں ہے زیست کا جز رنج دی
ہے ٹوٹنا پسند مجھے شاخ بید کا
دیوار کھا لگے کوئی نشوونما تے تاک
ہستی کا قافلہ ہی عدم کی طرف رواں
مانو تو کچھ ہے اور نہ مانو تو کچھ نہیں
ہر دم ہی وہم شماری پیہم سی دل کو کام
ناداں اپنے نفس پہ کرتا ہے آپ ظلم
اس زلف مشکبو کی سیاہی کہیں ملے

تھا یہ بھی شعبدہ کوئی لیل و نہار کا
گنبد ذرا بلند ہو میرے مزار کا
پہنچا فلک کو گور میں صد فشار کا
کیا توڑتا ہے پھل گریباں تار کا
ہے جوش میں لہو رگ ابر بہار کا
کیا پوچھنا غبار سر رہ گزار کا
لو میں سمجھ گیا یہ اشارہ شرار کا
ہے جھومنا پسند مجھے لالہ زار کا
دامن پکڑ لیا ہے نسیم بہار کا
دور سپہر ایک تتق ہے غبار کا
بازار میں بھی چلنا اعتبار کا
کھٹکا لگا ہوا ہے یہ روز شمار کا
شکوہ زباں پہ ہے ستم روزگار کا
کالا کروں گا سینہ میں شب انتظار کا

سجدہ کیا ہے جب سے ترے آستان پر
ہے عرش پر دماغ ترے خاکسار کا

شاہوں کو ناز تخت مرصّع پہ ہے تو ہو
مالک ہوں میں بھی کلک جواہر نگار کا

۴۴ ۲۳

سینہ میں دل ہو دل میں کچھ ارمان ہو تو کیا
آنکھوں میں اشک اشک میں طوفان ہو تو کیا

سر ہی یہاں نہیں ہے جو سامان ہو تو کیا
داماں ہو تو کیا جو گریباں نہ ہو تو کیا

دو دن کے واسطے سر و سامان ہو تو کیا
سب کچھ سہی جو دل ہی میں ارمان نہ ہو تو کیا

مصحف پہ ہاتھ رکھ کے قسم کھا گئے ہیں وہ
بد عہد کے گلے میں جو قرآں نہ ہو تو کیا

کیا اے فلک ملا ہمیں بازار دہر سے
ظالم متاع درد بھی ارزاں نہ ہو تو کیا

لایا ہے کوئی ساتھ نہ لیجائے گا کوئی
دولت ہو اور عادت احساں نہ ہو تو کیا

ہے قد سے قد ملا کے بہت سرو کو غرور
اس طرح ناز سے جو خراماں نہ ہو تو کیا

نالو سہی جب زباں نہیں لگتی جناب کی
تا صبح بھلا دماغ پریشاں نہ ہو تو کیا

راضی ہوں قتل خون سے تیغ کیجیے
تسکین دل جو عیسیٰ دوراں نہ ہو تو کیا

سالک کو حق کے ڈھونڈنے میں کچھ فراغ
اس راستہ میں بھول بھلیاں[۱] نہ ہو تو کیا

دن میری زندگی کے گذر جائیں صبح تک
آنا بھی طول شب ہجراں نہ ہو تو کیا

رکھا نہ معصیت نے کہیں کا ہزار حیف
بندہ ہوا وہ تابع فرماں نہ ہو تو کیا

مانا کہ تو نے غیر کیا نظم اپنا حال
معلوم اس کو حال پریشاں نہ ہو تو کیا

۱؎ بھول بھلیاں محاورہ میں مفرد مؤنث ہے ۱۲

ناکہ تو نے جوگ لیا درد عشق میں
اس حال پر بھی گر کوئی پرساں نہو تو کیا

یہ تو بتا کہ چاک گریباں سے فائدہ
جب تیرا ہاتھ اور اس کا گریباں نہو تو کیا

ناکہ تیرے اشک میں گوہر کی ہے چمک
عارض پہ اس کے وصل میں غلطاں نہو تو کیا

اچھا یہی سہی کہ وہ محشر خرام ہے
تیوروں کے نیچے دیدۂ حیراں نہو تو کیا

یوں خاک و خوں میں لوٹ گئے تم تو کیا حصول
قاتل کا اپنے ہاتھ میں داماں نہو تو کیا

جھک جھک کے ڈھونڈتا ہی عبث اس گلی میں تو
اس خاک میں ترا دل نالاں نہو تو کیا

جاتا ہے اس کے در پہ تو اتنا سمجھ تو لے
گر تیرے روشناسوں میں درباں نہو تو کیا

گر اذن عام غیر کو ہے تو ہوا کرے
تیرا گذر وہاں کسی عنواں نہ ہو تو کیا

کہتے ہو جو پڑیگی مصیبت اٹھائیں گے
لیکن وہ ظلم کر کے پشیماں نہو تو کیا

سوچی ہو جان دینگے جو دشوار ہوگا وصل
مرنا بھی مری جان جو آساں نہو تو کیا

۴۵ ——— ۱۱

بندہ کسی طرح نہ سزائے جحیم تھا
یارب میں رو سیاہ سہی تو کریم تھا

کوٹھے پہ آکے نعش کا جانا تو دیکھ لے
لے اٹھ گیا جو تیری گلی میں مقیم تھا

واعظ خدا کے واسطے اس کو تو دیکھ
جیتے اگر نہ مے تو گناہ عظیم تھا

کیا کرتے ہم کہ ضبط سے گھبرا گیا تھا جی
کھینچی اک ایسی آہ کہ بس دل دو نیم تھا

نازک ہوا تھا کا دماغ فروتنی
ہم کو تو سر اٹھانا ہی بار عظیم تھا

دنیا کی نعمتوں میں برابر کا زہر ہے
اصلاح تو یہ دیکھئے آخر حکیم تھا

اب ہم تھے اور حسرت اعمال قبر میں | آخر کوئی رفیق نہ کوئی ندیم تھا
دنیا سے دل اٹھا کے محبت بھی دیکھ لی | اک دوش پر جنازۂ امید و بیم تھا
ساتوں فلک نہ بار امانت اٹھا سکے | ہم نے اٹھا لیا وہ جو بار عظیم تھا
اے آسمان میری تباہی روا نہ تھی | تھا خاک بھی تو خاک رہ مستقیم تھا

اے نظم خوب راہ نمائی جنوں نے کی
گلشن سے دشت ایک خط مستقیم تھا

١٦ — ١۵

میں پا کے اس سے عفو کا پروانہ چھٹ گیا | اہل خرد دھرے گئے دیوانہ چھٹ گیا
کیا حال پر ملال شب غم بیاں کروں | ظلمت وہ تھی کہ شمع سے پروانہ چھٹ گیا
آتی تھی اب مزہ پہ کہانی شباب کی | کس لطف کے مقام سے افسانہ چھٹ گیا
کس راستہ سے ناقۂ لیلیٰ کو لے چلا | اے ساربان قیس کا ویرانہ چھٹ گیا
مستی میں ایک کی نہ رہی ایک کو خبر | شیشہ سے بزم عیش میں پیمانہ چھٹ گیا
کاجل لگا کے لاش پہ رونے کو آئے تھے | اشکوں سے رنگ نرگس مستانہ چھٹ گیا
تو اضطراب شوق بھی نکلا حریف غم | چٹکی میں آکے شمع کی پروانہ چھٹ گیا
قابو سے نفس بد کو نکلنے نہ دے کبھی | پھر شیر ہی ہے جو یہ سگ دیوانہ چھٹ گیا
دیکھا فریب حیرت بزم وصال کا | دست مژہ سے سبحۂ صد دانہ چھٹ گیا
دی آکے کیا نسیم نے حیرت فزا خبر | ہر شاخ گل کے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

تھا وصل روح و تن نفس واپسیں تلک
دم بھر میں ایک عمر کا یارانہ چھٹ گیا

احسان یہ کیا عرق انفعال نے
دامن سے داغ گریہ مستانہ چھٹ گیا

واعظ بتا مجھے کہ یہ کس کی نظر لگی
ہونٹوں تک آکے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

زاہد جو شہر چھوڑ کے صحرا نشیں ہوا
اس کو یہی قلق ہے کہ میخانہ چھٹ گیا

دکھلائے کیا وطن میں اب اے نظم خستہ حال
ہو اس لیے اداس کہ ویرانہ چھٹ گیا

۴۷ ——— مفعول فاعلاتن دوبار ——— ۱۴

پرسش جو ہوگی تجھ سے جلاد کیا کرے گا
لے خون میں نے بخشا تو یاد کیا کرے گا

ہوں دام میں پرافشاں اور سادگی سے حیراں
کیوں تیز کی ہیں چھریاں صیاد کیا کرے گا

ظالم یہ سوچ کر اب دیتا ہے بوسۂ لب
جب ہونٹ سی دیئے پھر فریاد کیا کرے گا

زنجیر تار داماں ہے طوق اک گریباں
زور جنوں نہ کم ہو حداد کیا کرے گا

ہم ڈوب کر مریں گے حسرت رہیگی تجھ کو
جب خاک ہی نہ ہوگی برباد کیا کرے گا

یعقوب نے قطع کر دیں امید وصل دل سے
یوسف سا بندہ کوئی آزاد کیا کرے گا

دل لے کے پوچھتا ہے تو کس کا شیفتہ ہے
بھولا ابھی سے ظالم پھر یاد کیا کرے گا

اے خط بیاض عارض درکار ہے جو تجھ کو
تحریر حسن کی کچھ روداد کیا کرے گا

کنج قفس سے اک دن ہوگی رہائی اپنی
مر جائیں گے تو آخر صیاد کیا کرے گا

مثل سپند دل ہے بیتاب سوز غم میں
رہ جائے گا تڑپ کر فریاد کیا کرے گا

اے شیخ بھر گیا ہے کیوں وعظ کی ہوا میں
ریش سفید اپنی برباد کیا کرے گا

ظلم و ستم سبھی اب ظالم نے ہاتھ کھینچا
اس سے ستم وہ بڑھ کر ایجاد کیا کرے گا

از بسکہ بے ہنر ہوں میں ننگ معترض ہوں
مضموں پہ میرے کوئی ایراد کیا کرے گا

اے نظم جس کو چاہے وہ دے بہشت دوزخ

نمرود کیا کرے گا شداد کیا کرے گا

۴۴ — مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن — ۲۰

واعظ نے در کعبۂ عرفاں نہیں دیکھا
عارف نے صنم خانۂ امکاں نہیں دیکھا

جی بھر کے ابھی جلوۂ جاناں نہیں دیکھا
تم نے اسے اے موسیٔ عمراں نہیں دیکھا

گلشن نہیں دیکھا کہ بیاباں نہیں دیکھا
جمعیت دل کا کہیں ساماں نہیں دیکھا

یہ آئینہ خانہ ہے طلسمات خودی کا
ویراں اسے دیکھا بھی تو ویراں نہیں دیکھا

دل تا لب خاموش ہے نالہ کی گذرگاہ
گردوں کو حریف خم چوگاں نہیں دیکھا

پھر رک نہ سکینگی یہ جوانی کی امنگیں
روکو ابھی توسن نے بیاباں نہیں دیکھا

زاہد کی کمیں گاہ سے واقف ہے بھلا کون
کیا جانے وہ جس گرگ نے باراں نہیں دیکھا

کیا جانے پریشانی خاطر وہ کسی کی
اس نے تو کبھی خواب پریشاں نہیں دیکھا

پہنچا وہی منزل پہ ملی جس کو رہ راست
اس کو کبھی افتاں کبھی خیزاں نہیں دیکھا

آساں ہے جسے سمجھے اسے آسان ہی پایا
مشکل جسے سمجھے اسے آساں نہیں دیکھا

دم لے کے ذرا راہ میں جب تک کہ میں اٹھوں
کوسوں تجھے اے عمر گریزاں نہیں دیکھا

رہ رہ کے اڑی خاک سلاطین سلف کی
گردوں سے کبھی دست و گریباں نہیں دیکھا

جس تیر نے پلہ نہ کیا ہے وہ پر کاہ
بیکار ہے جس تیغ نے میداں نہیں دیکھا

وادی حقیقت میں بھرا ہو وہی جانے
ایسا بھی جنوں خیز بیاباں نہیں دیکھا

ہے گلکدۂ دہر میں حیرت کی تجلی
نرگس نے کبھی سایۂ مژگاں نہیں دیکھا

مستوں کیلئے رشک کی جا ہی سفر برق / جز ابر سیہ و رشبستاں نہیں دیکھا

کیا حال گلستاں کا ہے جھکو نسے خزا نکے / طاؤس کو اس طرح پرافشاں نہیں دیکھا

ہے سایہ فگن فرق پہ گرد قدم اپنی / پھرتے ہوئے یوں چتر سلیماں نہیں دیکھا

وحشت میں بھی پابند رہا وضع کا اپنی / تو جیب کوئی جز چاک گریباں نہیں دیکھا

کیا پوچھنا اے نظم اس آزادہ روی کا
یوں سرو کو بھی برزادہ داماں نہیں دیکھا

٤٩ ٢١

سب دل کا بخار آنسو نکے تار نے کھینچا / آندھی کو رگ ابر گہربار نے کھینچا

ہر اشک تہ سیلاب میں جھنکار کی آواز / پرکالہ دل گریہ سرشار نے کھینچا

نقشہ نہ کھینچا خواب پریدہ کا کسی سے / کھینچا تو مرے دیدۂ بیدار نے کھینچا

ایسی ہے ترے ہاتھ کے بوسونکی تمنا / اس شوق میں چلہ لب سوفار نے کھینچا

شق القمر انگلی کے اشارے سے دکھایا / قشقہ جو بت آئینہ رخسار نے کھینچا

کن کن قد موزوں نے سنبھالا / کس بوجھ کو ہو سکر یار نے کھینچا

بگڑے کبھی جیکی ہی سے گیسو شب عشرت / نالہ کبھی پازیب کی جھنکار نے کھینچا

چھپ چھپ کے بھی رویا تو گنہگار ہوا ہیں / محشر میں گریباں غم دلدار نے کھینچا

میرا دل پر داغ ہے افشاں کا ستارہ / کاکل سے رسائی ہوئی رخسار نے کھینچا

مجنوں کو مری وحشت نے دردی یہ حسد سے / کانٹا جو چبھا پاؤں میں خو دیار نے کھینچا

جب آہ کی آثار سحر کے نظر آئے
سورج کی طنابوں کو دل زار نے کھینچا

چھالوں نے مرے پاؤں کو آنکھوں سے لگایا
دامن کو مرے بخت کے سر خار نے کھینچا

پھر تم مجھے کہنا نہ کبھی مرشد منصور
نعرہ نہ انا الحق کا اگر دار نے کھینچا

جو رنگ لگانے کا جو ابرو کو ہوا شوق
آہوے حرم طرۂ طرار نے کھینچا

لی ابر بہاری نے پر زاغ کی رنگت
نقشہ دم طاؤس کا گلزار نے کھینچا

گریہ کا تعلق مری پلکوں سے عجب ہے
سیلاب کا دامن نہ کبھی خار نے کھینچا

خورشید سحر گاہ کا جب تک نہ کیا خون
غنچہ بھی نہ ہنسا وہ شب تار نے کھینچا

لہرانے لگا خون جگر نوک مژہ پر
گلزار کو خار سر دیوار نے کھینچا

تو راہ زن سعی تھا ابلہ ... پا
اچھا ہوا سعلی یہ تجھے خار نے کھینچا

ہو رہے گلرنگ رہا شب کو ہلال تک
آغوش میں بیہوش کو ہشیار نے کھینچا

سعلی نظر آئے گی مسیحا کو فلک پر
نالہ جو کسی دن ترے بیمار نے کھینچا

۵۰ ۵۱

باور سخن غیر کو فریاد نہ کرنا
سمجھاؤ گے ایسا کہیں استاد نہ کرنا

صدموں کا گلا اے دل ناشاد نہ کرنا
جلاد کو چاہا ہے تو فریاد نہ کرنا

گیسو سے رہا تم دل ناشاد نہ کرنا
اب دام میں لائے ہو تو آزاد نہ کرنا

یہ تو نہیں کہتا میں کہ بیداد نہ کرنا
ہاں اپنی طرف سے کوئی ایجاد نہ کرنا

بھولا نہیں فرقت کا زمانہ مجھے اب تک
وہ میرا تڑپنا وہ ترا یاد نہ کرنا

وہ خاک اڑانے کو تو آئے سر مدفن
اور ہیں یہ کہو خاک کو برباد نہ کرنا

چٹکی ہے کلی کوئی نہ کوئل کوئی کوکی
نالہ ابھی اے مرغ چمن زاد نہ کرنا

ہم سے وہ اس اقرار پہ کرتے ہیں ملاقات
ہم ظلم کریں تم پہ تو فریاد نہ کرنا

یا دیر تڑپنے میں مزہ آتا ہے مجھ کو
تو قتل میں جلدی کہیں جلاد نہ کرنا

سمجھے ہی جادہ ہیں بزرگان سلف کا
دیکھو مرے اشعار پہ ایراد نہ کرنا

بندہ تو اس اقرار پہ بکتا ہی ترے ہاتھ
لیتا ہے اگر مول تو آزاد نہ کرنا

او وعدہ خلاف اپنے تغافل کی قسم ہے
تا عمر مجھے بھول کے بھی یاد نہ کرنا

اے نظم عجب لطف ہے دیوانہ دلی میں
ہاں ترک کبھی عشق پریزاد نہ کرنا

۵۱ — فعلاتن مفاعلن فعلات — ۱۶

کبھی تیوری چڑھا کے دیکھ لیا
اور کبھی مسکرا کے دیکھ لیا

اف نہ کی آزما کے دیکھ لیا
تم نے چھریاں لگا کے دیکھ لیا

دل کو تلووں سے مل کے وہ بولے
کیوں ذرا تلملا کے دیکھ لیا

دیکھ سکتے تھے آنکھ سے نہ جسے
اس کو دل میں چھپا کے دیکھ لیا

پھول سے ہیں سبک قدم اس کے
ہم نے آنکھیں بچھا کے دیکھ لیا

حال اس شوخ نے مرے دل کا
کیا نظر میں سما کے دیکھ لیا

مجھ پر احسان ہو نزاکت کا
تو نے گر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا

دیکھنا ہی نہ تھا ادھر دلِ زار
تیرے کہنے میں آ کے دیکھ لیا

دھجیاں آستیں کی کہتی ہیں
ہاتھ بیجا بڑھا کے دیکھ لیا

مر گیا میں سمجھ کے پیچ اس کو
کیوں بہانہ بنا کے دیکھ لیا

ایک ہی ہاتھ کا تھا سارا جہاں
ہاتھ ہم نے اٹھا کے دیکھ لیا

کچھ نہ سمجھا کہ اس نے جاتے وقت
ہائے کیوں منہ پھرا کے دیکھ لیا

کچھ کروانی ہی سی کرتا ہے
دل کے ٹکڑے اڑا کے دیکھ لیا

نزع میں بھی ملا جو نامہ یار
اٹھ کے بیٹھا اٹھا کے دیکھ لیا

دل کی چوری بھی کھل گئی اب تو
آنکھ تم نے چرا کے دیکھ لیا

نہ ہوا داغ کا جواب اے نظم
طبع کو آزما کے دیکھ لیا

کام آخر نہ ہونا تھا نہ ہوا
فکر کاہے کی اب - ہوا نہ ہوا

خاک پا ہو کے نقش پا نہ ہوا
تیرے قدموں سے میں جدا نہ ہوا

دل تو دیتا ہے تو مجھے یارب
اور اگر درد آشنا نہ ہوا

حسن اس کا نہ آنکھ دیکھ سکی
سات پردے تھے سامنا نہ ہوا

ہم کو کہنا تھا جو وہ کہہ گزرے
دل میں قائل ہوا وہ یا نہ ہوا

لہ زمین انہی مرحوم کی نکالی ہوئی ہے ۱۲

تونے روزِ الست حیف اے نظم
وعدہ تو کرلیا وفا نہ ہوا

۵۲ ولہ ۱۶

دم گیا شوقِ جستجو نہ گیا — دل گیا داغِ آرزو نہ گیا
ہاتھوں کی صفا سے شرما کر — آئینہ اس کے روبرو نہ گیا
کہیں ہوتے ہیں سنگ دل ایسے — رحم دل میں تمہارے چھو نہ گیا
لے اُڑا مرغِ نامہ بر مکتوب — دلِ بیتاب ساتھ تو نہ گیا
خاک میری رہی صبا کے ساتھ — مر کے بھی شوقِ جستجو نہ گیا
گھونٹ ڈالا گلا گریباں نے — دستِ کوتاہ تا گلو نہ گیا
خلد میں خاک پھر ملے گا لطف — ساتھ جب ساغر و سبو نہ گیا
تھا جو مجھ کو لحاظ قاتل کا — اُڑ کے دامن تلک لہو نہ گیا
پی کے مئے شیخ ہوگیا بے خود — پھر بھی تقوی رہا وضو نہ گیا
بولے وہ سہے نہ جوشِ شباب — ہائے ایک جوشِ آرزو نہ گیا
تا کمر پہنچے طرۂ سنبل — مثلِ گیسوئے مشک بو نہ گیا
میری آغوش کی سی شکل جو تھی — شرم سے وہ کنارِ جو نہ گیا
کسی محفل میں وہ بہارِ حسن — بے طلسمات رنگ و بو نہ گیا
مر رہا آکے میں ترے در پر — ٹھوکریں کھانے کو بکو نہ گیا

اڑ رہا ہوں غبار ہو ہو کر | زورِ پروازِ جستجو نہ گیا

نظمؔ اس سال بھی زیارت کو

جانے والے تھے لوگ تو نہ گیا

۱۲ ۹۴

خیال و خواب سا گذرا نظر مثلِ سراب آیا

یہی جلدی تھی جانے کی تو کیوں عہدِ شباب آیا

کہاں اے نظمؔ لے کر کاروانِ صبر و تاب آیا

جہاں سو بار طوفاں موجِ خیزِ اضطراب آیا

شبِ غم میں ستاروں کے لئے روزِ حساب آیا

مری اختر شماری کو سمجھتے ہیں عذاب آیا

سحابِ تیرہ لے کر خیمۂ مشکیں طناب آیا

اور اس ظلمات میں ساقی نہ لے کر آفتاب آیا

عبث کی گردشِ افلاک نے گہوارہ جنبانی

نہ دل ٹھہرا نہ غم بھولا نہ موت آئی نہ خواب آیا

نکل اے جانِ مضطر میں بھی اب ہوں ہمعناں تیرا

ٹھہر اے عمرِ رفتہ میں بھی تیرے ہم رکاب آیا

فلک اندر فلک ہے کائنات اس بزمِ عالم کی

مے عشرت کا پیمانہ حباب اندر حباب آیا

جواہر ریز ہے گردوں طرب انگیز ہے ہاموں
شفق سے شیشۂ شبنم میں یاقوت مذاب آیا

قدم سے طاقت رفتار کچھ کہتی ہے رہ رہ کر
میں اب جھک جھک کے چلتا ہوں کہ سن لوں کیا جواب آیا

شب غم میں نہ پوچھو دم نکلنے میں ہے کیا لذت
اجل اس طرح سے آئی کہ میں سمجھا کہ خواب آیا

رہے قسمت نہ خنجر کیا جی بھر کے نظارہ
نہ بسمل کی پلک جھپکی نہ قاتل کو حجاب آیا

نہ جا میخانہ میں اے نظم ہم تجھسے نہ کہتے تھے
وہاں سے ہوکے تم مدہوش و بے مست و خراب آیا

۵۵

حرف (ب)

۱۵

اٹھتا ہوں مثل گرد قدم کی صدا سے کب — پاؤنگا قافلہ کا پتہ نقش پا سے کب

مٹتا ہی احتیاج کا داغ التجا سے کب — او ہرزہ کار آگ بجھی ہے ہوا سے کب

سختی کو جھیل جا تو سعادت شکار ہے — خالی ہے اس پہاڑ کی چوٹی ہما سے کب

ہرگز گھٹا نہ عشق رہ مستقیم کا — سر کا یہ آفتاب خط استوا سے کب

کب ہوگا برطرف غم و اندوہ اے کریم — پانی سفید ہوگا کالی گھٹا سے کب
فریاد کس سے کیجیے گردوں کے دور میں — نکلی پسے ہوؤں کی صدا آسیا سے کب
تو بھی تو ہم کلاب تھا اے شوق کوئے یار — پیچھے میں رہ گیا ہوں صدائے درا سے کب
ہوتی ہے آبرو کو ہوس کیا حرص میں فروغ — اٹھتی ہے موج آب گہر میں ہوا سے کب
ہے اس طرف ہر ایک رگ جاں کھنچی ہوئی — یہ ربط کاہ کو ہے بھلا کہربا سے کب
پہنچی ہے ٹھیک وقت پہ میخانہ تک گھٹا — کیا جانیے چلی تھی یہ کوہ صفا سے کب
دو نسخے ہی ہیں گر ایکا لیجائے نفس شوم — یہ پوچھتا ہے راہ کسی رہنما سے کب
کیا جانیے کب طلسم خودی سے نجات ہو — نکلے یہ عکس آئینۂ ماسوا سے کب
ہم کو بقائے نام کی کچھ کیوں ہوس نہ ہو — دھویا تھا ہاتھ خضر نے آب بقا سے کب
جب دل کو ظلم سہنے میں آنے لگا مزہ — توبہ وہ کرنے بیٹھے ہیں جور و جفا سے کب

نکلے گا دل سے نظم کے کیونکر غم حسین
جاتا ہے رنگ لعل سے سرخی حنا سے کب

۶۵ — ولہ — ۹

کوئی مے دے یا نہ دے ہم رند بے پروا ہیں آپ
ساقیا اپنی بغل میں شیشۂ صہبا ہیں آپ
غافل و ہشیار رو و تمثال یک آئینہ ہیں
ورطۂ حیرت میں ناداں آپ ہیں دانا ہیں آپ

کیوں رہے ہے میری دعا منت کشِ بالِ ملک
نالۂ مستانہ میرے آسماں پیما ہیں آپ

ہے تعجب خضر کو، اور آبِ حیواں کی طلب
اور پھر عزلت گزینِ دامنِ صحرا ہیں آپ

منزلِ طولِ امل در پیش اور مہلت ہے کم
راہ کس سے پوچھیے حیرت میں نقشِ پا ہیں آپ

حق سے طالب دید کے ہوں ہم بصیرا [illegible]
ہم کو جو کوتہ نظر سمجھیں وہ نابینا ہیں آپ

گل ہمہ تن زخم ہیں پھر بھی ہمہ تن گوش ہیں
بے اثر کچھ نالہائے بلبلِ شیدا ہیں آپ

حرص سے شکوہ کروں کیا ہاتھ پھیلانیکا میں
کہتی ہے وہ اپنے ہاتھوں خلق میں رسوا ہیں آپ

ہم سے اے اہلِ تنعم منہ چھپانا چاہیے
دم بھرا کرتے ہیں ہم اور آئینہ سیما ہیں آپ

حرف (ت)

۱ دم لینے سے آئینہ مکدر ہو جاتا ہے ۱۲

سخن میں ہے گہر آبدار کی صورت
قلم میں ہے رگِ ابرِ بہار کی صورت

عدم کا خواب بھی نرگس کو خوابِ نوشیں تھا
کہ آنکھ کھول کے دیکھی بہار کی صورت

طواف کیجیے اس آستاں کا جس سے
ہوئی فلک کے لئے روزگار کی صورت

قسم یہ دے کے چلی ہو کہ بیقرار نہ ہو
بتاتے جائیے دل کے قرار کی صورت

ہلالِ عید کو میں دشنۂ قضا سمجھا
کہ چاند دیکھ کے دیکھی رخِ یار کی صورت

ترے فراق میں لیں میں نے کروٹیں تا صبح
نہ بن پڑی کوئی لیکن قرار کی صورت

خدا دکھائے نہ دشمن کو بھی وہ کالی رات
بہت بری تھی شبِ انتظار کی صورت

خدا کا فضل ہے ملکِ دکن کے شاملِ حال
برس پڑے ہیں ابرِ بہار کی صورت

کبھی فراق میں تارے گنے کبھی گھڑیاں
نظر میں پھر گئی روز شمار کی صورت

بس انتظار جو کھینچا تو میری آنکھوں میں
کھچی ہوئی ہے تری انتظار کی صورت

ہر ایک برگِ خزاں دیدہ ہے وہ آئینہ
کہ جس میں دیکھ رہا ہوں بہار کی صورت

نہاں ہے فیض کا چشمہ بھی خاکساروں میں
کہ ابر کا ہے ہیولا غبار کی صورت

شگفتہ ہے گلِ تر کی طرح سے شعلۂ شمع
حریرِ شعلہ سے ظاہر ہے خار کی صورت

ہمیں کو دخل سفینہ سیہ میں تھا اے نظم
رہی نہ ہائے وہ لیل و نہار کی صورت

۵۰

کرتا ہے ظلم و جور یہ چرخِ کہن بہت
مل مل گئے ہیں خاک میں گل پیرہن بہت

اک مشت استخواں پہ گناہوں کا بوجھ ہے
تھا اس نحیف و زار کو بار کفن بہت

نقش چمن میں غفلت اہل جہاں کا ہے
اترا رہے ہیں پھول پہن کر کفن بہت

ہم کو بھی مل رہے گی کسی سے سخن کی داد
جوہر شناس سیکڑوں ہیں اہل فن بہت

٥٩ وله ٣٧

پر تو حسن تو در آئینہ تا افتادہ است
شور ما و من بہ بزم ماسوا افتادہ است

آئینہ در ورطہ از جوش صفا افتادہ است
طبع روشن ہر کہ میدارد زپا افتادہ است

کوچہ زلف و شب دیجور درہ تاریک و تار
دل بیفتاد و نمیدانم کجا افتادہ است

شکوہا دارم ز انداز گران جانی خویش
ہست چوں سنگے کہ در راہ وفا افتادہ است

کشتی صبرم بطوفان ہوا افتادہ بود
بر کنار اینک بہ موج بوریا افتادہ است

سایہ بر خورشید افتادست از زلف سیاہ
شعلہ در آئینہ از رنگ حنا افتادہ است

انس بگرفتم ز بس با خانہ ویرانی خویش

سبزۂ بیگانہ با من آشنا افتادہ است

شرمسارم عذر بدتر از گناہ آوردہ ام
پردہ بر روئے من از دستِ دعا افتادہ است

شور یارب بر لب و دست تظلم بر فلک
شیشۂ صبر من از بام دعا افتادہ است

من ہمہ تن گوش باشم بر صدائے الرحیل
در دو چشم گرد آواز درا افتادہ است

ماندگی پائے من سلسلے کہ بر من بستہ بود
بر سرم از صدمۂ شور درا افتادہ است

برق را گفتم مجوز ہستی راہ گریز
از میانِ جست و در آغوش فنا افتادہ است

چون الف آہے کشم وز ہستی خود بگذریم
در کمند وحدتم صید فنا افتادہ است

گردشِ نہ آسمان و یک دلِ نالانِ من
دانہ ہست و بدستِ آسیا افتادہ است

انقلاب چرخ نتواند مرا از جا برد
من دلے دارم کہ قطبِ آسیا افتادہ است

باز آمد تشنہ کام از بسکہ اسکندر بدید
چشمۂ اندر چشمۂ آب بقا افتادہ است

نسبتے دارد حدوث دہر با لوح قدم
ہمچوں آں نقشے کہ بر آب بقا افتادہ است

ہر قدر نزدیک تر آید بگردد دور تر
سالک راہش برہ چوں نقش پا افتادہ است

سرنگوں گشتم ز پیری من کجا و فکر شعر
طرز مضموں بلندے پیش پا افتادہ است

سید ہر جام فنا برکف صلا ضحاک دہر
دور جم آخر شد و نوبت بما افتادہ است

نقد فرصت را بیغامی برد نفس حریص
حیف از یں دزدے کہ در کالا بجا افتادہ است

ناروائی ہست آذین دکان اہل فن
نقد معنی چوں متاع نارسا افتادہ است

کہکشاں با کج روی تا آسمانہا سر کشید
بر زمیں چوں نظم خط استوا افتادہ است

بسکه جوشِ اضطرابِ شوق برقِ خرمن است
تا تو دریابی مرا من نیستم خاک من است

از غمِ عشقش بیا ساکم نه این کار من است
خوش بیفروزیم آتش تا هوا در دامن است

تا مرا تابِ توان و هوش خرمن است
جمله وقفِ انتظار و شوق برقِ ایمن است

از کواکب بر سرِ ما ریخت گردِ فتنه‌ها
چرخ گردان آسیا هم ست و هم پرویزن است

وہم ہستی بسکه چشمت را غبار آلود کرد
تا تو می‌بینی مرا من نیستم گرد من است

موسیا وا رفتگان گفتگوئے یار را
در صدائے لن ترانی موج برق ایمن است

کاروان اشک خون بر رہ گذر گذشت دوش
نقش پائش از سرِ موئے مژه تا دامن است

نکہت گل را بگفتم رخ ہمی پوشی چرا
گفت می‌جوئم مرا خون وفا بر گردن است

از ہجومِ ظلمتِ اندوه و غم مضطر مباش

بعد شب صبح ست و بعد از صبح روز روشن ست

ما سراغ حق همی گیریم از نامحرمان
کاندرین وادی چراغ راه چشم رهزن ست

درس عبرت را ازین پیر طریقت یاد گیر
چنگ در بزم طرب محو فغان و شیون ست

میکشد در ره ترا این سعی بیجا ای سپند
نردبان دود دل کوته ز بام شیون ست

طی کند صد ساله ره از برگ گل تا آفتاب
بهر شبنم این کرامتها ز قلب روشن ست

حاصل عمر خود از بهر تماشا سوختی
نظم این جوش طرب بر رقص شرار خرمن ست

وله ٦٠

عشق از سوز دل من طرح آتش خانه ریخت
اخگر از آتش گرفت و در دل پروانه ریخت

کشتهٔ آن ترک مستم کز سر ناز و غرور
کافرم پنداشت و خونم چه بیباکانه ریخت

چاره بی خوابیم ناید ز تو ای قصه خوان

درد و چشم صد نمک وان شور این افسانه ریخت

گرد چون خورشید تیغ خونچکانش در نیام
چرخ از شب دام بگشاد و ز اختر دانه ریخت

٦١ وله ١٦

هوس به غم خرد و مدعای دیگر داشت
صواب دید دگر بود و رای دیگر داشت

اگرچه خضر رفیق طریق بود ولی
سلوک منزل دل رهنمای دیگر داشت

نه گشته ایم مکدر ز صدمهٔ نفسی
که آب آینهٔ ما صفای دیگر داشت

جهانست صفحهٔ اعمال مرد دانستم
که لغزش قدمم نقش پای دیگر داشت

صعود کردم تا لامکان و برگشتم
که گوشهٔ دل روشن فضای دیگر داشت

دلم اگرچه بخود هرچه کرد بهر کردست
ولی خیال نکوئی بجای دیگر داشت

مگو که ناله کشیدیم و بر نخواست صدای
شکست گنبد مینا صدای دیگر داشت

ز کنج صومعه این جا رسیده بر خوردم
که کنج میکده آب و هوای دیگر داشت

بجرم عشق تو کشتی مرا و شاد شدم
چرا که کشتهٔ تو خونبهای دیگر داشت

مپرس حال ز خود رفته براه فنا
که جادهٔ دگر و نقش پای دیگر داشت

به زعم من همه بودیم طالب ره دوست
براه فتنه فتادن بلای دیگر داشت

به بزم عیش بنه دل به شکوهای فراق
حکایت شب غم ماجرای دیگر داشت

بوهم رشک برفتیم و باز گردیدیم
که راه کوچهٔ او نقش پای دیگر داشت

متاع هوش بباد فنا بداد و گذشت
مگر بدیدن رنگم هوای دیگر داشت

به پند ناصح نادان که گوش ننهادم
کلام او سخن ناروای دیگر داشت

۵ — فریب نغمهٔ بلبل نخورده ام ای نظم
زخامه ام نفس مشک سائی دیگر داشت

---

٦٢ ۱۲

ز کنه واجب او ار هیچ نتوان گفت
هر آنچه گفت کسی با بحد امکان گفت

غم تو در دل من آنچه گفت پنهان گفت
میان جمع ندانم چه چشم گریان گفت

هر آنچه گفت گل از خواب خود پریشان گفت
ز بزم گلکده تر زبان با برق و خندان گفت

به شاهراه طلب ذوق سعی را نازم
که مشکلی که برو عرض کردم آسان گفت

ورود لشکر و وادی نمل و مور ضعیف
ز همتش نتوان هیچ با سلیمان گفت

امان ز باد فنا نیست در حصار سپهر
چراغ مهر شنیدی چه زیر دامان گفت

چه خواست تیر نگاهش ز من نه دانستم
که هر چه گفت مرا از زبان پیکان گفت

زهی مروت ابر و زهی استغناش
صلا بخوان کرم برکشیده اما گفت

ز عشق ضبط فغان طرفه لذتی دارد
حکایتیست که نتوان شنید و نتوان گفت

غزل اگرچه بگلبانگ بلبلی ماند
هزار نکته درو شاعر سخندان گفت

حکایتی ز تماشای بزم و حاصل دید
که شمع کشته نگفت از زبان مژگان گفت

کسی چه گوش نهد بر بیان نظم بحشر
که خواب هستی خود گفته و پریشان گفت

۶۳ — وله — ۱۱

کامگار است هر که ناکام ست | زانکه گیتی طلسم اوهام ست
بدمگو هر که راکه بدنام ست | نام او خود بجائے دشنام ست
فال باده کشی مزن واعظ | خط پیمانه حلقهٔ دام ست
دین و دنیا بهم نخواهد رفت | طمع بست و سر بسر خام ست
انفعال گناه و حسرت دید | چشم بر پاء جلوه بر بام ست
گرد بادیم در راه کوچهٔ دوست | نیت ما طواف و احرام ست
آستانش کجا و سجدهٔ . . . ما | بوسهٔ عاشقاں به پیغام ست
اصل گیتی ست جوش بادهٔ عشق | کهکشاں حلقهٔ خط جام ست
جست از جا سپند و رمزے گفت | کز عدم تا وجود یک گام ست
بنده آں کسم که در عالم | نیک کردار و نیک فرجام ست

نظم دانسته ام بیاعم سپهر
صبح آغاز و شام انجام ست

۶۴ — قطعه — ۵

مرکب ماست کوکب سیار | از مسیرش سنین و اعوام ست
او دریں راه خویش غلطنده | شام تا صبح صبح تا شام ست
تا هلال از هلال یک منزل | تا صباح از صباح یک گام ست

که قریب است و گه بعید از شمس — قرب و بعدش فصول ایام ست
هر چه بینیم ما همی بینیم — که زمین فرش و آسمان بام ست

۶۵ — شاه صدر اعظم بهادر — ۹

دل همه زخم و دو زلفش شکن اندر شکن است — در خم هر شکنش نافهٔ مشک ختن است
نو بهارست و پری خانه به مینا دارم — جنبش بال پری موج شراب کهن است
رفت عمر و ز چمن دور و اسیر قفسم — در دلم نقش هواخواهی سرو و سمن است
خواستم نافه ز زلفش بکشایم در باغ — گفت هشیار که غماز نسیم چمن است
بسکه بیگانه‌ام از صحبت ابنای زمان — بر سرم گرد غریب الوطنی در وطن است
ابر بر کوهی غم تو می‌گرید زار — برق ازین ره که تو غافل ز دلی خنده زن است
قبرها بود زمین غرق بخون ناحق — شاهد راز درون لالهٔ خونین کفن است
غزل شاد که سلک گهرش می‌گویند — شهرهٔ حسن قبولش ز دکن تا عدن است
برتری از دگران اهل سخن راست بجا — جوهر ذاتی انسان سخن است و سخن

۶۶ — وله — ۷

آورد عرض بار امانت چنان شکست — پشت سپهر تا کمر کهکشان شکست
موج چو سیل سر زده از قلزم شهود — در وادی سپهر کران تا کران شکست
سوز فراق و گریهٔ شبهای تا حیف — بنیان شمع از سر تا استخوان شکست
پیر مغان براه کرم جرعه‌ٔ بداد — گرد خمار هستی من جاودان شکست

غم گشت پشت مرد و بدل آرزو بماند | تیر کش ہنوز ناشدہ خالی کماں شکست
ایں قید و بند بود پے مرغ روح من | تا من رہا شدم قفس استخواں شکست
مرغے بہ بیش ابر بہ رفت و صدا نکرد | از سنگ ریزہ گردن پیل دماں شکست

۶۷ ——— ۱۹

حرف ح

دور کھینچے نہ گریباں کی طرح | لوٹ جاؤنگا میں داماں کیطرح
پاؤں پھیلائے ہیں داماں کیطرح | ہاتھ کھینچا ہے گریباں کیطرح
چل گیا مجھ پہ یہ دو دھار اخنجر | پھر گئی آنکھ بھی مژگاں کیطرح
تیرے عاشق کا یہ دل تھا ظالم | توڑ ڈالا جسے پیماں کیطرح
سر جھکا کر نہ اٹھایا ہم نے | تیغ آئی تیرے احساں کیطرح
میرے غماز کا ہے منہ کالا | میرے ہی نامۂ عصیاں کیطرح
کھاتے ہیں ترک محبت کی قسم | ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ قرآں کیطرح
اے قناعت ترے صدقے ہو جاؤں | میں ہوا پر ہوں سلیماں کیطرح
پر کدورت ہے دل زار ایسا | خاک اوڑتی ہے بیاباں کیطرح
مجھ کو حیرت ہے کہ خورشید بھی ہے | زر فشاں جلوہ عثمان رضی اللہ عنہ کیطرح
نظم کے پاس تھا کعبا دل کے سوا | کھو دیا اس کو بھی ایماں کیطرح

کیا تھا ابر نے نالہ میری فغاں کیطرح
زمین نکل گئی قدموں سے آسماں کیطرح

الٰہی آج کا ابر اسقدر تو جھک آئے
کہ ڈھانک لے در میخانہ سائباں کیطرح

دکھا رہی ہے مجھے بیخودی نیا عالم
جو اس زمیں کیطرح ہے نہ آسماں کیطرح

کوئی نشاں نہ ملا کسطرف گئے احباب
بھٹکتے رہ گئے ہم گرد کارواں کیطرح

نزول رحمت باری ہے آج کثرت سے
کہ ابر کشتی مے پر ہے بادباں کیطرح

دل و جگر کبھی کا جسکو یوں تڑپتے تھے
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی سناں کیطرح

جہاں میں صاحب ہمت کی یہ نشانی ہے
عروج پائے جھکے سر آسماں کیطرح

سوا نمود کے ہستی دہر کچھ بھی نہیں
یہ حلقہ پیچ سے خالی ہے کہکشاں کیطرح

۶۸ ۱۰

اس مہینہ بھر کہاں تھا ساقیا اچھی طرح
آ ادھر آ عید تو مل لیں ذرا اچھی طرح

انگلیاں کانوں میں رکھکر اے مسافر سن ذرا
آ رہی ہے صاف آواز درا اچھی طرح

چشم موسیٰ لا سکی کب اوسکی جلوہ کی نہ تاب
چشم دل سے جسکو دیکھا بارہا اچھی طرح

فاصلہ ایسا نہیں کچھ عرش کی زنجیر سے
کیا کہوں پہونچتا نہیں دست دعا اچھی طرح

اہل صورت کو نہیں ہے اچھی سیرت سے غرض
اچھی صورت چاہیے اچھی ادا اچھی طرح

غنچہ ہاے لالہ و گل کی خبر لائی ہے کچھ
سال بھر کے بعد آئی ہے اے صبا اچھی طرح

سیکھ لیگی بل کی لینا تا کمر آنے تو دو
بل ابھی کرتی نہیں زلف دوتا اچھی طرح

شیشہ و جام و سبو بھر لے مے گلرنگ سے
آج ساقی گھر کے آئی ہے گھٹا اچھی طرح

لیتے ہیں اہلِ جنوں کیا کیا تصور کے مزے — آنکھ سے پریوں کو دیکھا بارہا اچھی طرح
دے رہی ہے اسکی خاموشی صدائے دورباش
یہ نہیں کہتا کہ نظمِ مبتلا اچھی طرح

حرفِ خ

۶۹ — ۱۲

سمجھا ہوں عیش و طیش جہاں خراب تلخ — ہے جام واژگوں میں فلک کے شراب تلخ
دنیا کو آنکھ بھر کے نہ تھا دیکھنا تجھے — ہستی کا ایک جام بھی ہے اے حباب تلخ
پیری سی جھکے عہد کوئی بے مزہ نہیں — شیریں تھا گر زمانۂ طفلی شباب تلخ
آیا تھا باغِ دہر میں کیا جانتا تھا میں — کر دے گا زندگی دلِ خانہ خراب تلخ
پیتا ہوں دُرد گنگا کے تو بڑھتی ہے تشنگی — پیاسا کنارِ بحر ہوں میں اور ہے آب تلخ
بے منتِ حریف جو حاصل نہ ہو سکے — ہے شیرِ ناب بے مزہ اور شہدِ ناب تلخ
سمجھوں میں کسطرح سے کہ شیریں ہے تیغِ یار — میں نے تو ہر سوال کا پایا جواب تلخ
ناصح فسانہ کہنے میں اگلا ہے تو نے زہر — سن سن کے ہو گیا مری آنکھوں میں خواب تلخ
اک دل جلا ہے اوداس تو محفل اوداس ہے — جامِ شراب تلخ ہے شورِ رباب تلخ
سمجھا ہوں جو کہ جنت و دوزخ سے ہم اور — یعنی کہ ہے کرم ترا شیریں عتاب تلخ
پوچھو زبانِ شمع سے کیونکر ملا فروغ — ہوتی ہے جانگدازی راہِ صواب تلخ
اے نظم جانتا ہوں فریبِ جہاں کو میں — پیاسے کے ہے مذاق میں موجِ سراب تلخ

۷۰ ۱۱

حرف د

نظر پڑا جو مجھے دام شک وہ صیاد
ہوئی ہے دل کو اسیری کی آرزو صیاد

نہ بوئے گل سے غرض ہے نہ صوت بلبل سے
نہ باغباں سے ہے مخالف نہ ہے عدو صیاد

چمن میں خوف اسیری کا ہر طرف تھا ہجوم
نکل سکی نہ مرے دل سے آرزو صیاد

یہ آرزو بھی نہ پوری ہوئی اسیری کی
سنائیں اپنی کہانی سنے جو تو صیاد

جو گل فروش ادا ہے تو بوسہ ہے گلچیں
وہ آج صید میں اور جوش آرزو صیاد

کیا ہے نطق اسیری نے مست بلبل کو
قفس ہے کیا مے گلرنگ کا سبو صیاد

لپٹ کے سرو سے قمری یہی تو کہتی ہے
مری تلاش میں پھرتے ہیں کو بکو صیاد

گرہ ہوئی ہیں رگ و پے سے جا بجا نالے
گلوئے نے کی طرح ہے مرا گلو صیاد

قفس میں یاد چمن کی یہ گل کھلاتی ہے
بنا ہے لالہ و گل خون آرزو صیاد

فغاں نہ کر سکے گھٹ گھٹ کے ہم تمام ہوا
گلے کی ہو گئی پھانسی رگ گلو صیاد

ہیں تو اپنی رہائی سے یاس ہے ناظم
کہ ہے غضب کا فسوں ساز و حیلہ جو صیاد

۷۱ ۱۰

آئینہ از پر تو او وادی ایمن شود
چشم آہو از نگاہش دیدہ روزن شود

حیف ازاں ساعت کہ خود نفس تو آہرمن شود
خوشترآں کس کو رہا از بند ما و من شود

عشوۂ او تیغ چوں بر من کشد ہنگام وصل
از دو گیسویش گرہ بکشائم و جوشن شود

اے کہ شمع بدفنم گشتی توقف کن کہ تا
شمع کشتہ باز از سوز دلم روشن شود

اف ازیں سوز نہانیہا کہ دل را خاک کرد
ہمچوں آں پرکالۂ آتش کہ در گلخن شود

نیست امکاں مفر از کوچۂ گیسوے او
جادہ بر خود پیچد و چوں افعیم رہزن شود

مایۂ صد گمرہی باشد دل صد آرزو
رہگذارش را چراغ از چشم آہرمن شود

کس نمی پرسید از حال من اے برق بلا
خندۂ بر من زدی اے چشم تو روشن شود

بادیہ گردی من پوشید عریانی من
گرد رہ در رہ قدم برخیزد و دامن شود

لذتے دارم چناں از کاوش مژگان تو

بشکنم نشتر بدل گر ناله شیون شود

۷۲ — ۱۲

جوش سرشک تا سر مژگان نمی رسد
وا از خون دیده گل بگریبان نمی رسد

بالاترست جلوه او از فراز عرش
آنجا نگاه موسی عمران نمی رسد

تا آنکه خود فنا نشود در ره طلب
شبنم به اوج نیر تابان نمی رسد

ابر سیاه در نظر جذب شوق ماست
این گرد سرمه تا به صفاهان نمی رسد

زنجیر عرش بست و ندانم ز بهر چیست
آنجا که دست سلسله جنبان نمی رسد

دیدند اهل دل ثمر قدکشی سرو
آری سر غرور به سامان نمی رسد

تا دست و پا بموج تبسم نمی زند
طفل شگوفه تا گل خندان نمی رسد

در کاروان دویدند بوی یوسفی
گرچه برآمدست و بزندان نمی رسد

دامن کشان گذشت سر کشتگان خویش
دستش کسی بگوشه دامان نمی رسد

عالم و طوف دشت و بیابان چه گرد باد
دیں خاک ما عمر گریزان نمی رسد

بی راهبر مباش که این کاروان گل
بی سعی نامیه به گلستان نمی رسد

هرچند تیز گرد بود دانه سبحه
اما به آب گوهر غلطان نمی رسد

بدام این نفس از افسون نه از افسانه می آید
چنین کار رستگ از همت مردانه می آید

بیک اشک ندامت مزرع اخلاص شاداب است
سر شاخ مژہ خرمن بدوش این دانہ می آید
وہد تا مژدہ جام صبوحی مے پرستاں را
بیک شب گیر ابر از کعبہ تا میخانہ می آید
اگر ضبط نفس شرط است در میخانہ عرفاں
کہ بے قلقل شراب از شیشہ در پیمانہ می آید
عیاں از اہتزاز شعلہ شمع است ایں معنی
ہوائے خوش زباں افشانی پروانہ می آید
براہ دوست عاشق از سر جاں بگذرد آرے
بسر غلطیدنی از گوہر یک دانہ می آید
فغاں از مستی ساقی کہ دیدم کشتی مے را
کنار جو بموج لغزش مستانہ می آید
درین زنداں تن از دم شمرد نہا نیاسایم
نسیم جانفزا از کوچہ جانانہ می آید
سرد گر سر کشد از بندگی نفس
بشر در عالم ایجاد آزادانہ می آید
ز حال خود گذشتن نیست کار بادہ پیمایاں

کہ جوشِ بادہ ایں جا تا خطِ پیمانہ می آید
نگرود وں تیرہ ابرے بر شد و مستند میخواراں
کہ پندارند بر دوشِ ہوا میخانہ می آید
ز احوالِ سویدائے دل مضطر چہ می پرسی
کہ چوں اسپند و ر پرواز بیتابانہ می آید
ز پاسِ وضع رندان نگزرم تا اندریں محفل
اقامت از صراحی گردش از پیمانہ می آید
فروغِ حسن راشد ناگزیر اسبابِ رسوائی
کہ ہر جا شمع روشن می شود پروانہ می آید
کلامِ بے ہنر کز گنجِ معنی ہست بے بہرہ
صدائے بوم را ماند کہ از ویرانہ می آید
نمی آید ز ہر کس رام کردن نفسِ سرکش را
چنیں کار سترگ از ہمتِ مردانہ می آید
تراشش تا کنم اے نظم از دل گریہ مینا
بگوشِ من صدائے خندہ پیمانہ می آید

حرف ر

۲۶ ۷۴

فاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات

نگاہ ناز سے بسمل گرینگے بسمل پر
یہ وہ خدنگ ہے آتا ہی چھوٹتے دل پر

نظر ٹھہرتی نہیں روئے یار کے تل پر
چمک رہا ہے ستارہ سا ماہ کامل پر

جہاں کی لہلہی مصیبت ہی گردش فلکی
وہ نجھ ہے کہ بھنور پڑ رہا ہے ساحل پر

پلک جھپکنے میں ہے منہدم بنائے جہاں
کھڑی ہوئی ہے عمارت آئینہ گھر کے تل پر

نوائے شادی و غم دونو ایک تھی خوش بہ
کہ پس گیا گل نغمہ کف جلاجل پر

کیا تھا میں نے ابھی طے نہ وادی غربت
کہ پہونچی شام غریباں سواد منزل پر

ہمیں تو قلزم ہستی سے تھی عبور کی فکر
نہنگ بن گئی سر موج آ کے ساحل پر

ملی نہ غمکدۂ دہر میں جگہ اتنی
کہ روؤں بیٹھ کے میں نامرادی دل پر

اوتر کے بام سے آیا نہ پھر وہ رونق بزم
وہ نور پھر کبھی اترا نہ شمع محفل پر

چلی ہے دہر میں کیسی ہوائے بیدردی
کہ ہو رہی ہے ہنسی نالۂ عنادل پر

تو ہم سے سیکھ لے اے قیس طرز بیتابی
اتار لیتے ہیں لیلیٰ کو چڑھ کے محمل پر

اولجھ کے دور و تسلسل میں رہ گئی جو لو
اونہیں ہے رشک سر طوق او رسلاسل پر

پکارتی ہے یہ حسرت کہ ذبح کر کے مجھے
دیا ہے خون کا ٹیکہ جبین قاتل پر

جو یاد آ گئی ہے میرے دل کی بیتابی
پھڑک رہی ہے وہ انداز مرغ بسمل پر

نہ پوچھو قافلہ والو یہاں کا کوچ و مقام
کہ اک رکاب میں ہی پاؤں ایک منزل پر

یہ بے ثباتی ساز طرب پکارتی ہے
کہ نغمہ رنگ حنا ہے کف جلاجل پر

طواف شوق کو سیکھو انہیں پتنگوں سے
تڑپ رہے ہیں جو گر گر کے شمع محفل پر

نہیں مقام کہ اس جلتی چھاؤں میں موقع — نہ بیقرار ہو مرنا پہنچ کے منزل پر
ملا طریق وفا میں جو کوئی سنگ گراں — اٹھا کے راہ سے میں نے وہ رکھ لیا دل پر
نگاہ ناز کا مطلب ہے کیا نہ کچھ سمجھا — چھری جگر پہ کوئی اب لگائے یا دل پر
ہزار شکر کہ افعال میں تو جبر نہیں — ہزار حیف نہیں اختیار ہے دل پر
لگا دے تیر کے پرچھے تو بیقراری دل — کہ منہ کے بل میں تڑپ کر جا لگے اپنے قاتل پر
اے غبار کو جھٹکو نہ قافلے والو — کہ مجھ کو گرد میں لیکر پہنچ جائیگا منزل پر
کسی کو قبر میں بھی پھر نہ پائیگا کوئی — کہ دنیا سے گئے ہیں مہمان پہلی منزل پر

کجا وہ جلوہ گہ ناز تو کجا اے قطرہ
یہ آرزو تجھے اس حوصلہ پہ اس دل پر

۵۷ ——— فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل ——— ۱۷

کوچہ کوئی نکلے جو رگ جاں کے قریں اور — اس گنبد بے در سے نکل جائیے کہیں اور
ہو سکتا ہے عالم میں جو ہو مہر مبیں اور — تجھ سا تو تصور میں بھی عالم کے نہیں اور
دل لیکے ستمگار ہوا بر سر کیں اور — دل جان تو ڈر ہے کہ وہ بگڑے نہ کہیں اور
اللہ رے ساقی کا بجد ہو کے بلانا — کہتا ہوں میں بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور
زاہد ہے مرے اور ترے سجدہ میں بڑا فرق — شوق اور ہوس اور ہے دل اور ہے دیں اور
کوثر پہ بھی زمزم پہ بھی گذرا ہے تو واعظ — دیکھے ہیں کہیں ہم سے خرابات نشیں اور
خط لیکے جو قاصد ترا آیا تو میں سمجھا — لائے ہیں صحیفہ کوئی جبریل امیں اور

اس چھیڑ میں کوئی جو تڑپتا ہو تو مر جائے
وعدہ ہی کہیں اور ارادہ ہی کہیں اور

او قاتل بے رحم کوئی وار ادھر بھی
محروم رہا جاتا ہے اک خاک نشیں اور

مر کر بھی ہمیں صور قیامت کا ہے دھڑکا
باقی ہے ابھی اک نفس باز پسیں اور

مرقد میں گرا جاتا ہوں میں بار گنہ سے
جھکتا ہے جو گردوں تو دباتی ہے زمیں اور

وہ داغ جو قسمت میں لکھا ہے ہمیں تنہا
گھستا ہے جبیں ماہ تو ملتی ہے جبیں اور

اوڑنے میں لپکنے میں ہے شعلہ تر توسن
ہے قہر کہ دیتا ہے ہوا دامن زیں اور

خوشبو سی بوئی تھی تو شب وصل کی شب تھی
گیسو ہوئے برہم تو کھلا نافہ چیں اور

کوچہ میں ہے تیرے غم عالم سے اماں
پاتا ہوں ہوا اور فلک اور زمیں اور

تیر نگہ ناز نے کیا تفرقہ ڈالا
میں ہوں کہیں بسمل جگر و دل ہیں کہیں اور

وہ محفل ارباب صفا ہو گئی برہم
ان لوگوں میں باقی ہے اب اک نظم حزیں اور

٧٦ —— مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات —— ١٥

احسان لے نہ ہمت مردانہ چھوڑ کر
رستہ بھی چل تو سبزہ بیگانہ چھوڑ کر

مرنے کے بعد پھر نہیں کوئی شریک حال
جاتا ہے شمع کشتہ کو پروانہ چھوڑ کر

ہونٹوں پہ آج تک ہیں شب عیش کے مزے
ساقی کا لب لیا لب پیمانہ چھوڑ کر

افعی نہیں کھلی ہوئی زلفوں کا عکس ہے
جائے کہاں ہو آئینہ و شانہ چھوڑ کر

طول امل پہ دل نہ لگانا کہ اہل بزم
جائیں گے نا تمام یہ افسانہ چھوڑ کر

لبریز جام عمر ہوا آگئی اجل
لو اٹھ گئے بھرا ہوا پیمانہ چھوڑ کر

اس پیرزال دہر کی ہم ٹھوکروں میں ہیں
جب سے گئی ہے ہمت مردانہ چھوڑ کر

پھروں ہمارا آپ میں آنا محال ہے
کوسوں نکل گیا دل دیوانہ چھوڑ کر

اترا جو شیشہ طاق سے زاہد کا ہے یہ حال
کرتا ہے رقص سجدۂ شکرانہ چھوڑ کر

یہ سبحۂ ریا تو نشانی ہے کفر کی
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ چھوڑ کر

رندان میکدہ بھی ہیں اے خضر منتظر
بستی میں آئیے کبھی ویرانہ چھوڑ کر

احسان سر پہ لغزش مستانہ کا ہوا
ہم دو قدم نہ جا سکے میخانہ چھوڑ کر

وادی بہت مہیب ہے بیم و امید کا
دیکھیں گے سیر پہ دل دیوانہ چھوڑ کر

رو رو کے کر رہی ہے صراحی وداع اوسے
جاتا ہے دور دور جو پیمانہ چھوڑ کر

توبہ تو کی ہے نظم بنا ہوگی کس طرح
کیونکر جیو گے مشرب رندانہ چھوڑ کر

۲۲ ۱۵

بت کہتے ہیں کبھی کبھی تصویر دیکھ کر
سوجھی ہے دل لگی مجھے دلگیر دیکھ کر

واللہ آئینہ سے بھی پردہ کیا کرو
ڈرتا ہوں میں نگاہ میں تاثیر دیکھ کر

پہلو سے دو گھڑی نہ سرکتے تھے جو کبھی
گھبرا رہے ہیں وہ فن تاخیر دیکھ کر

سایہ کے ساتھ دھوپ بھی سر سے مرے ہٹ گئی
زلفوں میں روئے یار کی تنویر دیکھ کر

عالم سے مجھکو صانع عالم کی یاد ہے
معمار کا خیال ہے تعمیر دیکھ کر

سمجھے مری دعا کو ملک نزد بان عرش
پیہم صعود نالۂ شبگیر دیکھ کر

دوزخ میں اے کریم میں کیونکر گلہ کروں
تعزیر دی تو لائق تعزیر دیکھ کر

نالہ کی اپنے بے اثری یاد آگئی
تڑپا میں صید کو ہدف تیر دیکھ کر

گردوں پہ ہے حداثت سن کا یقین مجھے
پیہم یہ انقلاب یہ تغییر دیکھ کر

وہ ہیں غرور حسن سے ضحاک روزگار
شانوں پہ اپنے زلف گرہ گیر دیکھ کر

سفاک خلق تجھ کو خدا نے بنا دیا
اہل جہاں کو لائق تعزیر دیکھ کر

خالق عطا کرے مجھے دیوانگی عشق
آنکھیں بچھاؤں حلقۂ زنجیر دیکھ کر

جب دل الٹ چکا تو ہوئے ہیں وہ مہرباں
اب کڑھ رہے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

میرا گلا ہے ہاتھ مرا تم کو کیا غرض
بازو سے کیوں لپٹ گئے شمشیر دیکھ کر

اے نظم کچھ فلک کے ستم کا گلہ نہیں
کرتے ہیں شکر خواہش تقدیر دیکھ کر

۸۷ ——— فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ——— ۱۷

مجھ کو یارب تو عطا کر دل نالاں دوچار
دل ہوں دوچار تو ہر دل میں ہوں ارماں دوچار

اے جنوں مجھکو دکھا عالم امکاں دوچار
شش جہت کو میں سمجھتا ہوں بیاباں دوچار

گیسوؤں میں ہے شب وصل کا نقشہ باقی
کچھ گندھی رہ گئیں زلفیں تو پریشاں دوچار

میں ہوں وہ کشتۂ حسرت کہ لحد پر میری
اڑتے پھرتے ہیں حسینوں کے گریباں دوچار

شادی و غم کو یہ مانا کہ ہم ہیں لیکن
سیکڑوں دہر میں گریاں ہیں تو خنداں دو چار

نہ تو ہم تھے نہ کیا کچھ نہ کہا کچھ ہم نے
تہمتیں چند لگا دی گئیں بہتان دو چار

سایۂ سرو میں بیٹھے ہیں کہ آزاد ہیں ہم
کاٹ دینگے اسی کملی میں زمستاں دو چار

رات اندھیری تھی مگر سیکڑوں تارے ٹوٹے
آئی تھی خون کے آنسو سر مژگاں دو چار

ایک دانہ کی گرہ میں ہیں بہت سی خرمن
ایک غنچہ کی بغل میں ہیں گلستاں دو چار

لاکھ صدمے ہوں مگر عشق کا ایسا ہی مزا
کہ ہزاروں میں ہوئے ہونگے پشیماں دو چار

کیا ملا تجھکو صبا کھول کے غنچہ کی گرہ
نکلے دو چار جو دامن تو گریباں دو چار

اتنے فرقے ہوے کس طرح مسلمانوں کے
یہ تو معلوم ہے اترے نہیں قرآں دو چار

اپنے ساحل پہ جگہ دے ہمیں اے بحر کرم
تشنہ لب جھیل کے آئے ہیں بیاباں دو چار

پیکر خاک کجا اور کجا عقل و حواس
آ ترے ہیں منزل خاکی میں یہ مہماں دو چار

غم سے کیوں زرد ہی تو دیکھ تماشائے جہاں
رنگ بدلے گی ابھی گردش دوراں دو چار

کوچۂ تنگ میں ہیں سیکڑوں مضموں صفیں
میرے خامہ کیلئے چاہئے میداں دو چار

ان میں کے ہی اشعار میں حاصل اے نظم
آسماں بھر میں ستارے ہیں درخشاں دو چار

۷۹ — ٢٦

روئے ناصح بے درد کے سمجھانے پر
ہنس دئے راز غم عشق کے کھل جانے پر

ناز کرتا ہے فلک ظلم و ستم ڈھانے پر
اور زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل جانے پر

تف ہے اے دور فلک اس تیرے منجا پر
رشک ہے خضر کو سقراط کے پیمانہ پر

نہ تو یاروں پہ بھروسہ ہے نہ یارانہ پر
دیکھ دھوکا نہ یگانہ کا ہو بیگانہ پر

مجھ کو چھٹکے ہوئے تارے نہ دکھا اے گردوں
طائر عرش ہوں گرتا نہیں میں دانہ پر

سعی سے باز نہ آ آب رواں کے مانند
نقش تدبیر کا بن بن کے بگڑ جانے پر

حیف چھاتی پہ سلاطین کے دھرے ہیں پتھر
خس کی ٹٹی نہ بھی قبر کے تہ خانے پر

نہ تسلط ہے کسی کا نہ مزاحم کوئی
سو خزانے ہوں تصدق کروں ویرانہ پر

سلسلہ خواب پریشاں کا ہے بیداری بھی
ہوش آیا نہ ہمیں ہوش کے بھی آنے پر

نہ ملی موج حوادث سے تہمتن کو پناہ
تیغ پہ رکھی ہے جوشن پہ نہ دستانہ پر

حرص کیوں آئے یہاں تو ہے قناعت سے گذر
کہہ دو ہمّی کا ہے جھنڈا مری کاشانہ پر

کس طرح میں نہ تری دام میں آلجھے دل
کہ مرا نام تھا لکھا ہوا ہر دانہ پر

چونکو ہشیار ہوا سے سیارہ میں سونیوالو
اب تو عبرت ہو تمہیں صورت کے ڈھل جانے پر

سو سخن شہر خموشاں میں لب گور پہ ہیں
ہمکو ہوتی نہیں عبرت کسی افسانے پر

سرکشو گور غریباں میں کیا حال ہوا
سر اوٹھایا نہ کبھی پاؤں سے ٹھکرانے پر

کچھ نہ اندیشہ عقبیٰ ہے نہ فکر دنیا
رشک کس طرح نہ عاقل کو ہو دیوانہ پر

اس زمانے میں بچا نے تو کہاں تھا او غافل
دل کو جب ناز تھا قابو سے نکل جانے پر

کاسہ گر نے تو نہ پائی کہیں جمشید کی خاک
نام لکھا ہے تو لکھا ہے پیمانہ پر

جانفشانی میں اور انداز پر افشانی میں
رشک ہے ولہ کو مجھ پر مجھے پروانہ پر

بادہ خواری کا بُرا ہو کہ ہی اوقات اب تو
مر گئے گر جلنے پہ ساغر کے چھلک جانے پر

نامۂ شوق کا مطلب تو پڑھ کر دیکھو
رقص کرتا ہے کبوتر مرے افسانے پر

اے نسیم سحری کس سے یہ شوخی ہے بتا
چاک ہوتے ہیں گریباں ترے اٹھلانے پر

زر فشاں ہونے کو ناحق نکل آیا خورشید
ابر آمادہ تھا ہُن باغ میں برسانے پر

کیا خبر کون ہے بیہوش یہاں آپ ہیں کون
وہ بھی دیوانے ہیں جو ہنستے ہیں دیوانے پر

ہمہ تن گوش تو ہیں گل مگر اے مرغ چمن
کان رکھتا بھی ہے کوئی ترے افسانے پر

ایک جلوہ کے سوا کچھ بھی نہ دیکھا اے نظمؔ
بیخودی بزم میں چھائی رہی پروانہ پر

٨٠

ہوش پر تیرے ہیں افعی کبھی رخسار و نیر
ناک انگور درختوں پہ چڑھی تھی کل تک
بھڑکی تھی لب جاں بخش کا شہرہ سن کر
میں وہ نالاں ہوں کہ ہوں بین کی پیدا آواز
رحم مجھ پر تو نہ آیا تجھے مرتے مرتے
یا نہیں گر دشمن مری تم ال دے تو دیکھی شراب
تلف عمر پہ زاہد ہے پریشاں کیسا
ہوش سودا میں یہ آتش قدمی تو دیکھو

٨١

خود ستمگر ہو عنایت ہے ستمگاروں کی
آج تو چاند پڑی باغ کی دیواروں پر
چشم فتاں نے چھری پھیر دی گلی رگ جاں پر
ہاتھ دوڑاؤں گریباں کے گر تار رگ جاں پر
مہربانی ہے یہ کیوں مہر کی غزاد ادر کی
منہ جو پوچھوں ہی تو ملکر تری رخسار و نیر
دیکھا رحمت کو ترنے جو گنہ گاروں کی
کہ میں شعلہ کی طرح دوڑتا ہوں خاروں پر

رکھتے ہیں ابرو و عارض صفت تیغ و ترنج
تو چھری پھیر گئی یوسف کے خریداروں پر

ہوس لذت بیداد نہ پوچھو مجھ سے
دل جب آتا ہے تو آتا ہے دل آزاروں پر

تکلف یہ ہے ابھی کچھ بھی نہیں اُسنے تلوار
ٹوٹ پڑتے ہیں گنہگار گنہگاروں پر

باغ سے قوس قزح کی نظر آتی ہے طناب
خیمہ زن ابر ہوا آکے جو کہساروں پر

ہوگیا مستو کی جھرمٹ میں جو خورشید غروب
صبح میں رنگ شفق پھولی ہے رخساروں پر

سختیاں عشق کی جس طرح سے جھیلیں گے
ہم نے دیکھی ہے تجلی انہیں کہساروں پر

جڑ لگی کس کی سواری فلک ششم سے
رشک جبریل کو ہے غاشیہ برداروں پر

سب سے دیکھا تجھے انگشت شہادت کی طرح
انگلیاں اٹھتی ہیں یوسف کے خریداروں پر

میرے نالوں کو جو کوٹھے پہ نہ آنے دو گے
چاندنی نکلے وہ رہ جائیگا دیواروں پر

دل ہٹیا ہے یہ شاید کسی دیوانہ کا
آج کوندا نظر آتا ہے جو کہساروں پر

لالہ پھولا تو یہاں آنکھوں میں سرسوں پھولی
بیخودی چھائی گھٹا دیکھ کے گلزاروں پر

سختیاں طالب دیدار اٹھاتے ہیں عبث
شکریں کھا چکے موسیٰ ہی انہیں کہساروں پر

نالے سو دہی فریاد ہی بیکار ہی نظمؔ
رحم آئیگا نہ ظالم کو گرفتاروں پر

۱۶ —— ۸۱

کروٹوں میں ہی رہا پھولوں کی شاخوں کی طرح
گندہ گیا ہار کی کلیوں میں مرا دل کیونکر

جذب دل کھینچ تو لے لیلی و سلمیٰ کو ہم
دیکھیں تو آتی ہے محمل میں محمل کیونکر

گورے گالوں پہ جو ٹھہری ہے نظر مشکل ہے
ہیں یہ چیلیں ہمیں کاجل کے بنی تل کیونکر

پا گئی راہِ فنا تو تو تڑپ کر اے برق
دیکھیں ملتا ہے ہمیں جادۂ منزل کیونکر

تجھ سے تو ضعف سے کروٹ نہیں بدلی جاتی
ہوں یہ حیران تڑپتا ہے مرا دل کیونکر

کسطرح باغ میں بہلیگا دلِ زار اپنا
اور سنی جائیگی فریادِ عنادل کیونکر

ہمتِ پیرِ مغاں کی ہے کرامات یہ سب
ابھی خالی تھی ابھی بھر گئی محفل کیونکر

تین دن تو رہی ظلمات میں کشتیِ ہلال
آگئی ڈوبتی تیرے لبِ ساحل کیونکر

برق رفتار ہی کیا قافلۂ عمرِ رواں
ایک دم میں یہ گیا سیکڑوں منزل کیونکر

دل کو رکھونگا میں اب باندھکے زنجیروں میں
دیکھتا ہوں کہ تڑاتا ہے سلاسل کیونکر

موجِ دریا سے یہ عبرت کا فسانہ سن لو
کشتیاں ڈوب گئی ہیں لبِ ساحل کیونکر

کچھ غبارِ سرِ رہ کو یہ خبر ہے معلوم
قافلے لٹ گئے آ کر سرِ منزل کیونکر

کچھ خبر شمعِ فروزاں کو ہے پروانہ کی
ایک جلوہ میں یہ سب ہو گئے بسمل کیونکر

دلِ پُر درد تو شیشہ سے سوا ہے نازک
اب کہو صبر کی چھاتی پہ دھروں سِل کیونکر

میں ہوں بیمارِ غم اور عمر کی منزل ہے پہاڑ
ناتوانی میں کروں قطعِ مراحل کیونکر

دورِ گردوں میں یہی بیقدریِ اربابِ کمال
جائے حیرت ہے کہ ہنگامہ کا ہل کیونکر

۸۴ ۱۴

دھوکا زلفوں نے دیا عنبرِ سارا بن کر
سحر آنکھوں نے کیا نرگسِ شہلا بن کر

مرضِ عشق میں سو مرتبہ میں مر کے جیا
پوچھ لو ان سے جو بیٹھے ہیں مسیحا بنکر

ہو گئی زلف پریشاں تو کمر سے اسکی
حلقۂ زلف لپٹنے لگے چھلّا بن کر

دن بھی نکلا تو بلائے شب فرقت منہ ٹلی
پیچھے پیچھے دوڑا مری سایۂ شب یلدا بن کر

پی لیا تھا جو مرا خون تری ناوک نے
منہ سے سوفار کے نکلا وہ کلیجا بن کر

اسقدر خاک میں پنہاں ہیں تپاں مہوش
گردباد اوٹھے تو رہ جائے کلیجا بن کر

ہر طرح کی حرکت نام کو ہم رکھتے ہیں
وہ اٹھتے ہیں نہ بیٹھتے ہیں نقش کف پا بن کر

اب مجھے صبح قیامت کی بھی امید نہیں
آگے فلک سر پہ گرا ہی شب یلدا بن کر

لاکھوں ہی شیشۂ دل توڑ ازا چور ہوئی
تب یہ تیار ہوا گنبد مینا بن کر

سبحۂ حضرت واعظ یہ نہ تھا مجھکو تیتوں
آکے گلا گھونٹ ہی ڈالے گا یہ پھندا بن کر

میری تصویر کبھی گر تری تصویر کے ساتھ
دیکھ لینا کہ بگڑ جائیگا نقشہ بن کر

باغ تو خوب ہی حسرت نے لگایا ہی مگر
مٹ نہ جائے کہیں دیکھو یہ گھروندا بن کر

خاکساروں کا تری شوق میں اُٹھا تھا غبار
رہ گیا ہے یہ وہی عرش معلیٰ بن کر

کیا ہوا ای نظم بیاں صبر و قناعت کا مزہ
نعمتیں مجھ پہ یہ اتریں من و سلویٰ بن کر

٨٣ — ١٢

در دنداں پہ چھپے صاعقہ افگن ہو کر
یا کنول بجھ گئی الماس کے روشن ہو کر

بھیس بدلے ہوئے رہتی ہی قضا عاشق کی
عشوہ ہو کر کبھی مارا کبھی چتون ہو کر

کیا سیاہی شب ہجر انیس ہے کیا تاریکی
رہ گیا شمع کا شعلہ گل سوسن ہو کر

وہ نہیں ہیں تو زمانہ ہے نظر میں اندھیر
شمع منہ اپنا ہی دیکھا کرے روشن ہو کر

وصل سمجھوں کہ اسی ہجر میں اے بندہ نواز
دور رہتے ہو قریب رگ گردن ہو کر

ہے غرور اہل جہاں سے کہ ملا ہے ہم کو
جادہ منزل عرفاں رگ گردن ہو کر

نگہ ناز نے تاراج کیا خانۂ دل
چور بنکر کبھی لوٹا کبھی رہزن ہو کر

نامرادی کا میں خوگر تھا بر آئی جو مراد
شکر منہ سے مرے نکلا بھی تو شیون ہو کر

گردشیں چرخ کی سر پر نہ ہوں جن سے مجھے
آگے قدموں پہ گریں حلقۂ آہن ہو کر

ماہ نو دیکھ کے اوس ترک کماں ابرو کو
مل گیا خاک میں نقش سم توسن ہو کر

سخت مشکل میں ہے جینا اوٹھی دیکھ کے حالت میری
نالے کرنے لگی زنجیر بھی آہن ہو کر

لکھنؤ گردش گردوں نے چھڑایا ہے ظلم
دور پھینکا مجھے آخر کو فلاخن ہو کر

۴۸ —— ۱۶

سرو قد حشر اوٹھا قامت ...
فتنے بیدار ہوئے نرگس جادو ہو کر

شام ہی سے یہ شب عیش کا عالم دیکھا
تا کمر آ گئی طول شب گیسو ہو کر

صبح ہے ای شب عشرت تری صدقے جاؤں
ڈھانک لے چہرۂ خورشید کو گیسو ہو کر

سنتے ہیں ہاں رہا ہے مرے دم پر نکلی فلک
سر پہ آئی جو بلا رہ گئی گیسو ہو کر

لب پہ ہے مہر خموشی کی مگر آنکھوں سے
حسرت دید ٹپک پڑتی ہے آنسو ہو کر

حسرتیں دل کی نہ نکلیں مری لیکن نکلیں
کبھی آہیں کبھی نالے کبھی آنسو ہو کر

یک بیک چمک اٹھا ہاتھ مہندی سے آئے شب وصل
شعلۂ شمع اڑا جاتا ہے جگنو ہو کر

دل اسی دنیا سے لگایا کہ میں آزادہ روش
چمنستاں میں نہیں بھی تو بسی بو ہو کر

لے گیا عہد جوانی نہ ہمیں ساتھ افسوس
ڈھونڈتے رہ گئے گرد رم آہو ہو کر

راہ میں خشک زراعت تھی نہ دیکھی ابر نے
کیا برستا ہوا جاتا ہے لب جو ہو کر

لے گئی عرش معلی پہ مجھے فکر سخن
جا پڑی پر تو آئینہ زانو ہو کر

بے سبب قتل کیا پھیر کے چتون اس نے
چل گئی دل پہ چھری جنبش ابرو ہو کر

آئینہ اس کو دکھانے جو لگا جوش شکر
رہ گیا سکتے میں وہ سرو لب جو ہو کر

دل اگر ایک طرف ہے تو جگر ایک طرف
تولتی ہے نگہ ناز ترازو ہو کر

مجلس سلیمہ بر منعاں سے نہ اٹھیں گے ہرگز
پاؤں اب توڑ کے بیٹھے ہیں دو زانو ہو کر

قدر اے نظم کسی نے بھی نہ جانی ہرگز
دامن دشت میں مہکا گل خودرو ہو کر

۵۸ ـــ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ـــ ۱۲

آستیں تو نے چڑھائی ہے مری تقصیر پر
کچھ بتاؤ تو سہی آخر یہ کس تقصیر پر

پانی اس صحرا میں نایاب رہے زخمی کو یاں
ایک قطرہ آب اگر دیکھا تو نوک تیر پر

آن ہے جن کی طبیعت میں عجب مشکل ہیں ہم
ہر قدم اس کارواں کا ہے دم شمشیر پر

سعی لاحاصل سہی میں باز آنے کا نہیں
ہنس دو تقدیر ہنستی ہے اگر تدبیر پر

صبر کی تلخی میں بھی لذت ہے وہ آتش نفس
مکھیوں کی طرح جو گرتے ہیں شہد و شیر پر

دل میں تھا صبا کے خود سپید ہو جانے کا خوف
پہلے تو وہ گنبد جو کچھ کہے عزم بلند
اپنے خرمن پر تسلط دیکھتے ہیں غیر کا
خوف رسوائی سے اٹھتی ہے صدا جھنکار کی
خاک کی چٹکی ہے کافی خاکساروں کیلئے
کہنے سننے کا اثر اغیار پر ہوتا نہیں

ٹوپیاں وسنی چڑھا دیں دیدہ نخچیر پر
بعد اسکے کہ بھروسا خواہش تقدیر پر
ہے بھروسا ہم کو برق نالۂ شبگیر پر
گر کسی کی آنکھ پڑتی ہے مری زنجیر پر
کیا دوا ہر درد کی موقوف ہے اکسیر پر
آرہا اہل وفا کا فیصلہ شمشیر پر

جانتا ہوں میں کجا خاک درِ جاناں کجا
نظم مجھ کو ناز ہے اس خوبی تقدیر پر

٨٦ مفاعلن فاعلن فعولن دوبار ١٨

ہنسی ہنسی میں وہ بات میں نے کہدی کہ رہ گئی آپ دنگ ہو کر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرہ کا رنگ ہو کر
ہمیشہ کوچ و مقام اپنا رہا ہے خضر رہ طریقت
رکا تو میں سنگ میل بنکر چلا تو آوازہ زنگ ہو کر
نہ توڑتے آرسی اگر تم تو اتنے یوسف نظر نہ آتے
یہ قافلہ کھینچ لائی سارا شکست آئینہ زنگ ہو کر
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پردہ ہے فسانہ
یہ رنگی بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

جو راز دل سے زباں تک آیا تو اس کو قابو میں پھر نہ پایا
زباں سی نکلا کلام بنکر گماں سی چھوٹا خدنگ ہو کر

غضب ہی بحر فنا کا دہارا کہ مجھکو الجھا کے مارا مارا
نفس نی سوچوں کا جال بنکر لحد نے کام نہنگ ہو کر

ملا دل نا حفاظ مجھکو تو کیا کسی کا لحاظ مجھکو
کہیں گریباں نہ پھاڑ ڈالیں جناب ناصح بھی تنگ ہو کر

جواب کی مینائے مے کو توڑا اچلی گی تلوار محتسب سے
لہو بھی رندوں کا دیکھ پینا بہا مے لالہ رنگ ہو کر

نہ ضبط سی شکوہ لب تک آیا نہ صبر آہ کھینچ دی
رہا دہن میں وہ قفل بنکر گرا یہ چھاتی پہ سنگ ہو کر

سمجھ لے صوفی اگر یہ نکتہ ہی ایک بزم سماع ہستی
تو نو پیالہ یہ آسماں کے بجیں ابھی جل ترنگ ہو کر

بھلا ہوا افسردہ خاطری کا کہ حسرتوں کو دبا کے رکھا
بچا لیا ہرزگی سی اس نے لحاظ ناموس ننگ ہو کر

جگر خراشی سے پائی فرصت نہ سینہ کاوی سے ناخنوں نے
گلا گریباں نے گھونٹ ڈالا جنوں کی شورش سے تنگ ہو کر

بدل کے دنیا نے بھیس صد ہا اسے ڈرایا اسے لبھایا

کبھی زن پیر زال بنکر کبھی بت شوخ و شنگ ہو کر
اوٹھی تھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر تامل نہ چاہیے تھا
کہ رہ گئی پیر و لکی حسرت شہید تیغ درنگ ہو کر
جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجوم یاس قتل میں حیدر
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل میں رہے دریغ و فنا ہو کر

١٣ مفاعیلن ۴ بار ٨٧

جنوں کے ولولے جب گھٹ گئے دل میں نہاں ہو کر
تو اٹھے میں ہوا ہو کر گرے میں بجلیاں ہو کر
کچھ آگے بڑھ چلے سامان راحت لامکاں ہو کر
فلک پیچھے رہا جاتا ہے گرد کارواں ہو کر
کسی دن تو چلے اے آسماں باد مراد ایسی
کہ اتریں کشتی میں گھٹائیں بادباں ہو کر
نہ جانے کس بیاباں مرگ نے مٹی نہیں پائی
بگولے جا رہے ہیں کارواں در کارواں ہو کر
وفور ضبط سے بیتابی دل بڑھ نہیں سکتی
گلے تک آ کے رہ جاتے ہیں نالے ہچکیاں ہو کر
گلوگیر اب تو ایسا انقلاب رنگ عالم ہے

کہ نعرے نکلے منقار عنادل سے فغاں ہوکر

جو ہوکر ابر سے مایوس[1] خود پہنچے کبھی دہقاں

جلادیں کھیت کو پانی کی لہریں بجلیاں ہوکر

جہاں میں واشدِ خاطر کے ساماں ہوگئیں لاشے

جگہ راحت کی ناممکن ہوئی ہے لامکاں ہوکر

ہنسے کوئی نہ بجلی کے سوا اس امر ماتم میں

اگر یہ جائے سارا کھیت کشتِ زعفراں ہوکر

الم میں آشیاں کے اس قدر تنکے چنے ہیں تے

کہ آخر باعثِ تسکیں ہوئے ہیں آشیاں ہوکر

گھٹائیں گھر کے کیا کیا حسرتِ فرہاد پر روئیں

چمن تک آگئیں نہریں پہاڑوں سے رواں ہوکر

دلِ شیدا نے پایا عشق میں معراج کا رتبہ

یہاں اکثر بتوں کے ظلم ٹوٹے آسماں ہوکر

ابھی ڈرتے ڈرتے دل سے اک حرفِ شوق نکلا تھا

---

[1] مایوس فارسی والوں کا تراشا ہوا لفظ ہے اور لغات فرس میں یہ بلحاظ عالم بہ فصیح ہے اور اب اردو میں بھی مستعمل ہوگیا ہے۔ اسے فارسی میں نہیں استعمال کرنا چاہیے منحوس بھی مایوس کے قیاس پر فارسی والوں کا تراشا ہوا ہے ۔۔ ۱۲

وہ اس کے سامنے آیا زباں پر داستاں ہو کر

نکل آتے ہیں ہر اقرار میں انکار کے پہلو
بنا دیتی ہیں حیراں تیری باتیں مکریاں ہو کر

نزاکت کا یہ عالم پھول بھی توڑے تو بل کھا کر
نہ جانے دل مرا کس طرح توڑا پہلواں ہو کر

تذرو و کبک پر ہنس کر اوٹھی خود لڑکھڑاتے ہیں
سبک کرتے ہیں ان کو بانکپنے بار گراں ہو کر

گلا گھونٹا ہی ضبط غم نے کچھ ایسا کہ مشکل ہے
کہ نکلے منہ سے آواز شکست دل فغاں ہو کر

نتیجہ اندیشۂ سالک نے پایا منزل دل کا
تو پلٹا لامکاں سے آسماں در آسماں ہو کر

ہوئی پھر دیکھیے آبستن شادی و غم دنیا
ابھی پیدا ہوئے تھے رنج و راحت توأماں ہو کر

جو نکلی ہو گی کوئی آرزو تو یہ بھی نکلے گا
تمہارا تیر حسرت بن گیا دل میں نہاں ہو کر

اوتر جائیگا تو او آفتاب حسن کوٹھے سے
گریگا سایۂ دیوار ہم پر آسماں ہو کر

۸۸ وله ۷

وہی سمجھیں گے اس کو جو نظر رکھتے ہیں جوہر پر
کہ اب تک ہنس رہا ہے آئینہ بختِ سکندر پر

خبر دیتا ہے بیتابی کی اشک خوں سر مژگاں
لہو کی بوند دیکھو اور کروٹ نوک نشتر پر

مئے عرفاں کہ جھوٹی کی ہوئی ہے میرے ساقی کی
ٹپکتی ہے مری رال اُس شرابِ روح پرور پر

بنائی جان ایسی سخت اور دل اسقدر نازک
زہی قدرت تری پھینکا ہے کیا شیشہ کو پتھر پر

بڑھایا کیا سمجھ کر اور اس پر بار عصیاں بھی
ازل کے دن سے کچھ بار امانت کم نہ تھا سر پر

کہیں ایسا نہو نالوں سے میرے حشر ہو جائے
مرا انصاف یارب تو نے کیوں رکھا ہے محشر پر

جو اشک آنکھوں میں بھر لائی ہو آئینہ دکھا دو نہیں
ڈھلکنا دیکھ لو شبنم کا رخسارِ گلِ تر پر

۸۹ فاعلاتن مفاعلن فعلات ۸

آفریں شوق گام فرسا پر | گر کے اٹھا ہوں میں ہر اک جا پر

باندھی ہے مدح شہ کی دھن میں نے
نغمۂ عندلیب شیدا پر

دے خدا اگر دل و زباں تو کرے
شکر راحت پہ صبر ایذا پر

جزر و مد میں فنا کے ہے عالم
یہ رہا ہے یہ قصر دریا پر

ق

آسماں پھینکتا ہے سنگ جفا
تاک کر قلب ناشکیبا پر

رقص اس گنبد زبرجد کا
ہے صدائے شکست مینا پر

کچھ سلیمان سے بھی زیادہ ہے
ناز منعم کو نقش دیبا پر

خطبہ پڑھتا ہے پیرزن کا غبار
عدل کسریٰ کا طاقِ کسریٰ پر

حرف ش

۹۰ ۱۴

خار حسرت کو ہے جگر کی تلاش
گل داغ جنوں کو سر کی تلاش

عشق میں تیرے ہے جہاں بیمار
چارہ گر کو ہے چارہ گر کی تلاش

اپنے دل میں خدا کو ڈھونڈھ لیا
حد سے اب بڑھ گئی بشر کی تلاش

میں دعا مانگتا ہوں محشر کی
ہے جو اک شوخ فتنہ گر کی تلاش

میکدہ کو ہمارے ڈھونڈھ لیا
گئی خالی نہ ابر تر کی تلاش

سرمہ خوش چشم کو ہے مد نظر
فتنہ گر کو ہے فتنہ گر کی تلاش

جو رہ عشق میں ہیں وارفتہ
نہیں رکھتے وہ راہبر کی تلاش

ایڑیوں تک پہنچ کے ٹھہری زلف | مصرع قد ہے رات بھر کی تلاش
دوپہر تک تھا انتظار اوس کا | دوپہر تک رہی سحر کی تلاش
مجھ کو سکتا ہوا جو ہجر کی شب | رہی آئینہ سحر کی تلاش
غرق رہتا ہوں فکر مضموں میں | ڈوب کر چاہیے گہر کی تلاش
یا الٰہی ہو ایسا جوش بہار | رگ گل کو ہو نیشتر کی تلاش
دل جو ٹوٹا تو پھر نہیں جڑتا | کیجیے خاک شیشہ گر کی تلاش

مل گئی قبر کی جگہ اے نظم
ہو گئی ختم عمر بھر کی تلاش

۹۱ —— مدح اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہٗ —— ۱۰

شب قدر است زلف عنبر بیزش | طلوع صبح عید است از جبینش
شہ با دل کہ حق یادش نگہبان | بہ تاج و تخت و ملک و داد و دینش
چناں آراست ملکش در زمانش | کہ مثل آسماں شد سرزمینش
معظم جاہ شد ماہ تمامش | چو اعظم جاہ شد مہر مبینش
رواں کردست دریا در بیاباں | کہ باشد بحر عماں در نگینش
فلک نیلی ز عکس آبگونش | زمیں سرسبز از ماء معینش
نہے ایں چشمہ سار صاف شیریں | عیاں راز دل از چین جبینش
چناں کشت دکن را کرد شاداب | کہ عذر ابر فلک شد خوشہ چینش

کنار رود موسی داو رنگاه	که موسی خاتم است و او نگینش
زهی شاهیکه در قالب بُد روح	صریر کلک معنی آفرینش

۹۲ ۱۳

وله

طلسمی بیش نبود لجهٔ هستی و سیلابش
که بر هم میزند موج فنا صد نقش بر آبش
زند صد قافله پی هم کند صد سلسله بر هم
گه از ابروی پرچینش گه از گیسوی پرتابش
دوای درد دل باشد لب آن عیسی دوران
که دارد طعم صد تنگ شکر اندر دو عنابش
چو اکسیر وفا خواهی شرار عشق روشن کن
دل مضطر بدست آور که بیتابیست سیمابش
رگ نخوت همی باشد طناب گردن ظالم
که بر خاک مذلت میکشد از فرش کمخابش
به زخم ابروی او لذت آزارده چنداست
که بوی مشک می آید ازین تیغ سیه تابش
اگر سر می نهم بر پای نازک سرگران گردد
وگر سر می کنم افسانهٔ غم می برد خوابش

سپہر و انقلاب بے ہم او نیست بے چیزے
کہ خون عالمے چوں آب خواہد ریخت دولابش

بگورستاں سر فغفور می بینم سر خشتے
کجا شد بالش قاقم کہ بد نازش گہ خوابش

اگر برخاست روزے گردباد از آہ مظلوماں
شکست اوتاد ایں نہ خرگہ نیلی و اسبابش

دریں جوش سرشک از ماجرائے دل چہ می پرسی
کہ سر بر زد حباب آسا بحر و برد سیلابش

عزیزے کو کہ از اسرار ہستی پردہ بر گیرد
دل خلقے بجاں آمد ز یک تعبیر و صد خوابش

نباشد صورتے فارغ ز معنی اندریں عالم
چو آئینہ قدم زن در رہ دیدار نایابش

حرف ض

۹۲ ——— ۱۰

چھیڑ ابر نے اوڑتی ہوئی دی [illegible]
کانٹوں پہ ہر دو راہ تو لکھوا [illegible]
آتا نہیں دریا کی روانی میں کبھی فرق

ساقی نظر فیض ہو ساقی نظر فیض
اک وار دی [illegible] نذر فیض
[illegible] نہیں کتنی نہیں شوریدہ سر فیض

کہتے ہیں جسے چشمِ طلب وہ تو ہو پیدا
اک جنبشِ مژگاں سے کھلیں لاکھ درِ فیض

طوبیٰ لکم اے اہلِ کرم واہ ری رفعت
لے اڑتے ہیں طوبےٰ کی طرف بال و پرِ فیض

اے پیرِ مغاں دستِ عزیز تیرے ہیں نقش
ہاتوں کی لکیریں ہیں کہ ہیں رہگذرِ فیض

کیا اہلِ قناعت کو غرض اہلِ غنیٰ سے
ہم کو ہے تو فضلِ الٰہ سے نہیں دردِ سرِ فیض

زاہد تجھے کیا اس کی کریمی سے عجب ہے
توبہ کا ہو در بند تو کھل جائے درِ فیض

گردابِ حوادث میں ہوں اے مبدءِ فیاض
اُتر جاؤں میں ہو جائے جو مجھ پہ نظرِ فیض

مانندِ نگیں آنکھ جھپک جائیگی اے نظم
اٹھ جائیں گے ہم چھوڑ کے اپنا اثرِ فیض

٩۴ — حرف (ف) — ١٦

پھری ہوئی مری آنکھیں ہیں تیغ زن کی طرف
چلا ہے چھوڑ کے بسمل مجھے بدن کی طرف

بنایا توڑ کے آئینہ آئینہ خانہ[1]
نہ دیکھی راہ جو خلوت سے انجمن کی طرف

رہِ وفا نہ چھوڑا وہ عندلیب ہوں میں
چھٹا قفس سے تو پرواز کی چمن کی طرف

گریز چاہیے طولِ امل سے سالک کو
سنا ہے راہ یہ جاتی ہے راہزن کی طرف

سفر کو ہیں ہو گے نا قلو کتک تک
اٹھو تو کیا نہیں جاتا نہیں وطن کی طرف

جو اہلِ دل ہیں اگر ہیں وہ اہلِ ناسر
نہیں ہے علم شیخ کو جانا ہے برہمن کی طرف

[1] آئینہ کے ہر ٹکڑے میں پورا عکس دکھائی دیتا ہے ہر ٹکڑا آئینہ بن جاتا ہے ۱۲

جہاں حادثہ آگیں میں لشکر کا ورود
الٹ کے حباب کا دریا ہے موجزن کیطرف

اسی امید پہ ہم دن خزاں کے کاٹتے ہیں
کبھی تو باد بہار آئیگی چمن کیطرف

بچھڑ کے تجھ سے مجھے ہے امید ملنے کی
سنا ہے روح کو آنا ہے پھر بدن کیطرف

گواہ کون ہے قتل کا محشر میں
ابھی سے سارا زمانہ ہے تیغ زن کیطرف

خبر دی کسی نے یہ بات اسکے آنے کی
خدا ہی خیر کرے رخ ہے انجمن کیطرف

وہ اپنے رخ کی صباحت کو آپ دیکھتے ہیں
جھکے ہوئے گل نرگس ہیں یاسمن کیطرف

تمام بزم ہے کیا محو اس کی باتوں میں
نظر دہن کیطرف کان ہے سخن کیطرف

اسیر ہو گیا دل گیسوؤں میں خوب ہوا
چلا تھا ڈوب کے مرنے چہ ذقن کیطرف

یہ سنگینوں کی ادا اتر بھی سکے گئے
لگا رہے جو سے جو اٹھے چلے چمن کیطرف

زہے نصیب جو ہو کربلا کی موت نظم
کہ اوڑھ کے خاک شفا آئے خود کفن کیطرف

۹۵

(۸)

ہوں میں بید ھا گیا وحشت میں بیاباں کیطرف
ہاتھ جس طرح سے آ ہی گریباں کیطرف

تھمے میرے دل مضطر کو یہ کیا آگئی
اوٹھ کے طوفان چلا دیدۂ گریاں کیطرف

دیکھنا لالۂ خودرو کا لہکنا ساقی
کوہ سے دوڑ گئی آگ بیاباں کیطرف

رو دیا دیکھ کے اکثر میں بہار شبنم
ہنس دیا دیکھ کے اکثر گل خنداں کیطرف

بات چھپتی نہیں پڑتی ہیں نگاہیں سب کی
اوس کے دامن کی طرف [illegible] کیطرف

نیک و بد داغ گنہ دھو گئے رحمت تری | کیا گھٹا جھوم کے آئی تھی گلستاں کی طرف
چشم آئینہ پریشاں نظری سیکھ گئی | دیکھتا تھا یہ بہت زلف پریشاں کی طرف

سر جھکائے ہوئے ہے نظم بیاں جامہ
سمت سجدہ کی ہے تیری خط فرماں کی طرف

حرف ق

۹۶ —— ۱۲

خاک جاں پر ہو مبتلائے فراق | لے چلی قبر میں بلائے فراق
ہے فلاطون عشق کا ارشاد | شربت مرگ ہے دوائے فراق
منہ بنانا ہے طرز نازش وصل | منہ پھرانا ہے اک ادائے فراق
شب فرقت ابھی سحر ہو گی | لب تک آئیں نہ نالہائے فراق
تھے مزے عشق کے جوانی تک | ہائے لطف وصال ہائے فراق
وصل یار کی تو دعا قبول نہیں | مانگنا چاہیے دعائے فراق
ہو گئی صبح رہ گیا قصہ | تھے ابھی لب پہ شکوہ ہائے فراق
تا فلک پہنچی تا اثر نہ گئی | واہ ری آہ نارسائے فراق
چشم پرخوں کا جام پر ہے یقیں | گریہ سمجھا میں خندہ ہائے فراق
آشنا بیتاب اضطراب کا ہے | دل کو حاصل ہے کیمیائے فراق
مس غم زرد سے ہے دل پر خوں | شور فریاد سے ہے صدائے فراق

جی بچا گر تو وصل یار سے پھر
جمیل نے نظم سب جفائے فراق

حرف م

۹۷ —— ۱۷

نہ پا سکے گل مقصود اس بہار سے ہم
ادھر تھی باد سیہ کے تجلی خورشید
اثر سے روز کے ہے وہ ہمارے حسن اسیر
فنا ہوں یوں کہ ملے بعد اس کے عمر ابد
رہیں گے صورت عیسیٰ نہ راہ ہستی میں
کمند بام حقیقت تھا عشق قامت یار
خدا کے واسطے جا یار سے کہے نہ کوئی
نشان کسی کو ہے معلوم عمر رفتہ کا
مٹی نہ کاہش جان بخ میں رہتے ہیں
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اٹھا کے داغ چلے باغ روزگار سے ہم
جھلک نہ دیکھ سکے پردہ غبار سے ہم
شکار کھیلتے ہیں دام آبشار سے ہم
نکالیں آب بقا ظلمت مزار سے ہم
پیادہ ہوگئے آ نکل جائینگے سوار سے ہم
فلک پہ چڑھ گئے عیسیٰ کی طرح دار سے ہم
اٹھا رہے ہیں یہ جبر اپنے اختیار سے ہم
[illegible] غبار سے ہم
خزاں [illegible] بہار سے ہم
[illegible]
[illegible]

عدم سے دہر میں برزخ سے آئے محشر میں
رکا نہ پاؤں نہ بیٹھے کہیں قرار سے ہم

خبر یہ صور میں تھی ہو کریم کا دربار
یہ شور سن کے نکل آئے سب مزار سے ہم

قطعہ

نہ سمجھے یہ کہ نمائش سراب کی ہے جہاں
غضب میں پڑ گئے ہستی کے اعتبار سے ہم

غضب کا رقص فلک نے ہمیں دیا دھوکا
رہے نہ آپ میں اک جلوۂ شرار سے ہم

ہزار معرکۂ امتحاں ہوئے اے نظمؔ
کسی سے کم نہ رہے فضل کردگار سے ہم

۹۸ —————————————— ۱۲

جاں در ہوائے بادۂ اطہر فروختیم
دل در بہائے ساغر کوثر فروختیم

در کار سالکاں زر و زیور فروختیم
وز بہر حفظ نام و نسب سر فروختیم

تا دل بہ آں دو زلف معنبر فروختیم
خود را فروختیم و مکرر فروختیم

جاں را برائے آبروئے خود فشاندہ ایم
سر را پئے گرفتن افسر فروختیم

درماندہ ایم زیر فلک چوں ہلال و بدر
تیغ آوریم بکف سر فروختیم

تا جا گرفت در دل ما خوف بازپرس
از رنگ روئے خود ورق زر فروختیم

ترک خودی جز اشک ندامت بہانہ داشت
آئینہ ہائے [illegible] گوہر تر فروختیم

در شعر بس بخون جگر پا فشردہ ایم
[illegible] گل تر فروختیم

رفتی غبار طبع بہ شیریں تبسمی
[illegible] شکر فروختیم

افتاد تا معامله با رحمت خدا | نامه سیاه به محشر فروختیم
رو داد و خانه مستی ما یکشاں مپرس | دستار را به شیشه و ساغر فروختیم
وارفتگی ما بخرام کسے مپرس | خود را بدست فتنه محشر فروختیم

وله

۹۹ —— مفتعلن فاعلات مفتعلن فا —— ۱۱

همتے از باد صبح گاه گرفتم | رفتم و از غنچه درس آه گرفتم
عزم شبی خوں ترا مبارک و فرخ | فال ز بشکستن کلاه گرفتم
دل بغمم تو نداشت تاب صبوری | اشک سراسیمه را گواه گرفتم
منفعلم از وفا بعهد محشر | دامن یوسف باشتباه گرفتم
مستی من از شراب گردش چشمیست | باده به پیمانه نگاه گرفتم
خار غمم از بسکه داشت تشنه لبیها | خون دل از خنجر برق آه گرفتم
باطن من شد ز شرم ظاهر من آب | نکته چو بر آب زیر کاه گرفتم
از قدمم گرد باد تا رگ ابر است | من ز بیابان سراغ چاه گرفتم
خاک بچشمم فشاند و قافله بگذشت | سرمه عبرت ز گرد راه گرفتم
نقش ستمگار را بکشتم و آنگه | دست و گریبان عذر خواه گرفتم

شعر اسیر است نظم شیخ رضا ما
آتش از آن گرمی نگاه گرفتم

حرف ن

۱۰۰ —— مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن —— ۲۰

مزہ بیاں میں نہیں اب اثر فغاں میں نہیں
بہار میں جو طبیعت تھی وہ خزاں میں نہیں

جو چل بسے نہیں انکا پتہ جہاں میں نہیں
نشان نقش قدم خاک رفتگاں میں نہیں

خوشی خوشی شب عشرت کسی میں کٹتا ہے
کہ ایسی رات کوئی عمر جاوداں میں نہیں

یہ دیکھنا گل و بلبل کی کیا بن آئی ہے
اب اتفاق جو صیاد و باغباں میں نہیں

سمجھی یہ جو صبا نکلیں گے آج قاتل سے
مرے سوا کوئی میدان امتحاں میں نہیں

چلی نہ چشم فسوں گر سے کچھ فسوں سازی
وہ سحر کونسا ہے جو مری بیاں میں نہیں

وہ سوکے اٹھے ہیں کسکو مجال عرض نیاز
غزل پہ پوچھیے یہ جرأت غزلخواں میں نہیں

بھبھو ڈال دی ہے میرے دلمیں انکی ناصح
مجھے عجب ہے کہ چھالا تری زباں میں نہیں

وہاں خمار تغافل سے سر گرانی ہے
یہاں شراب اثر شیشۂ فغاں میں نہیں

دیا مجھے تری نرگس نے ای غم عشق
وہ داغ جو یہ طاؤس آسماں میں نہیں

والہو تپ غم نے بیا تو حسین آیا
کہ آج صورت [illegible] کہکشاں میں نہیں

کشش جو دل میں ہے میری نظر جواہ [illegible]
[illegible] شب [illegible] کہکشاں میں نہیں

فلک شناس ہوا اس کا طرز دامن یہ
ستارہ دکھائی یہ تحریر کہکشاں میں نہیں

جگر میں عشق کا ہے داغ رخ پہ اسکی چمک
فروغ ماہ نہاں پردۂ کتاں میں نہیں

وہ کاش سائل دیدار کو جلا دیتا
کوئی شرار ترے سنگ آستاں میں نہیں

ہے ایک قافلہ ریگ روان عمر رواں
متاع درد محبت جو کارواں میں نہیں

رہے گی کشتیٔ تن غرق ہو کے خشکی میں
جو خاک لائی کشش ہے وہ بادباں میں نہیں

بزور ہمت مردانہ توڑ ہفت حصار
کہ راہ بندی رستم جو ہفت خواں میں نہیں

جو طبع رمز شناس و کنایہ فہم نہ ہو
تو کچھ مزہ گل و بلبل کی داستاں میں نہیں

برا نہ مان جو پہنچے کسی سے رنج اے ظلم
کہ ہوشیار کوئی دور آسماں میں نہیں

۱۰۱ ———————— ۱۵

حریف تم نہ سہی دوستدار بھی تو نہیں
وہ آنکھ اب نہ رہی وہ چاہ و پیار بھی تو نہیں

مرا لہو ہے زاہد جو پی نہ لے یہ جام
کہ دن ہے عید کا تو روزہ دار بھی تو نہیں

چمک گئی ہے کچھ ایسی کہ ابر و برق ہو مات
ہوا کے گھوڑے پہ یہ ظالم سوار بھی تو نہیں

نہیں ہیں ہستیٔ ناپائیدار کا قائل
کہ مستعار کہوں مستعار بھی تو نہیں

اٹھاؤں ظلم میں کس کس کا تو فلک میں عدو
کہ دل تو ایک ہے دو تین چار بھی تو نہیں

ہے ایک تار مرے جسم زار کو کافی
مگر کفن کے لئے ایک تار بھی تو نہیں

لحد کا پائیں گے کس طرح سے تنگ اعتبار
جنوں میں ایک جگہ پر قرار بھی تو نہیں

دل و جگر گئے تیغ نگاہ سے چورنگ
پھر اس پہ لطف یہ ہے آنکھ چار بھی تو نہیں

نہ دل لگا کے کبھی درد دل سنا میرا
ہزار بار کہا ایک بار بھی تو نہیں

یہ ہاتھ دوڑ رہا ہے عبث گریباں پر
کہ تار تار یہ ہے کچھ شمار بھی تو نہیں

کریم حشر میں مجھ سے حساب کیا ہوگا
کہ بے حساب گنہ میں شمار بھی تو نہیں

کہا کہ درد جگر پھر کہو میں کہتا ہوں
ستم یہ ہے کہ تمہیں اعتبار بھی تو نہیں

کسی گڑھے میں گرا دے نہ تجھکو توسن عمر
وہ تیز گام ہے تو شہسوار بھی تو نہیں

اوڑانے آئے تھے ہم خاک کوئے قاتل پر
[illegible] غبار بھی تو نہیں

یہ سچ ہے نظم سے [illegible] سوالی
جہاں میں ایسا کوئی پردہ دار بھی تو نہیں

۱۰۲ ---------- ۲۵

تو ایک آہ میں اے چرخ کچھ مدار نہیں
جو حال میں [illegible] خاکسار نہیں

کسی سے رسکہ امید کشود کار نہیں
مجھے اہل کرم [illegible] آپ کا اعتبار نہیں

مجھکو جو اہل تجھ سے خاکسار نہیں
فلک سے دب کے رہیں جو وہ غبار نہیں

فقیر خانہ میں اہل ہوس کو بار نہیں
کہ شمع بھی مری محفل میں تاجدار نہیں

پھر اور کیا ہے یہ عالم جو رہگزار نہیں
کہ ہستی گذران کا کچھ اعتبار نہیں

ہستی کے گذران ہونے سے معلوم ہوا کہ عالم رہگذار ہے

یہ آن بان طبیعت میں ہو تو انساں کیا
کہ [illegible] استوار نہیں

سنبھالے کون کسی کو [illegible] کسی کی خبر
کہ عالم [illegible] کوئی بھی ہوشیار نہیں

یہ مجھ [illegible] نقش [illegible] سکتا ہے
مزاج یار ہوں کچھ میرا اعتبار نہیں

کسی کے خون کا پیاسا ضرور ہو عیار
کماں میں تیرے قزاک میں شکار نہیں

جواب نامہ کا قاصد عذاب ہے یارا
کہا تھا تمھارے تاب انتظار نہیں

یہ کہہ کے اٹھ گئی بالیں سے میری شمع
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں

زمیں سخت فلک دور پر شکستہ ہوں
مزہ ہے جان کبھی دینے پہ اختیار نہیں

قریب تر رگ گردن سے کچھ بھی ہے تو وہ
نظر کے سامنے وہ پھر بھی آشکار نہیں

کسی کے جلوہ کو اس مشت خس سے کیا نسبت
وہ تھا تحفہ نہیں شعلہ نہیں شرار نہیں

جو وہ ہو پاس تو حور و قصور سب کچھ ہو
جو وہ نہیں تو نہیں بلکہ یہ بہار نہیں

چھپے جو عالم شبستاں ... گلی کوچہ
چراغ لیکے بھی ڈھونڈو تو پھر مزار نہیں

گذر سے ... ... اور ...
تو کیا قریب یہاں نخل سایہ دار نہیں

گذر رہے ہیں عجب مستعار مثل نسیم
کسی کو خار نہیں میں کسی پہ بار نہیں

عدم کا قافلہ کیا جانے کس طرف کو گیا
ذرہ بھی گرد نہیں راہ میں غبار نہیں

وہ سمجھے کہ تیری کہنہ یہ جو چلے ناصح
میں ہرزہ گرد نہیں ہوں نہیں ہرزہ کار نہیں

خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
کہ رنگ و بوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں

فلک ہے وہ ستمگر کینہ ور خدا کی پناہ
عقال پاؤں میں جس کے نہیں مہار نہیں

نکلتی حسرت ارماں کی کیا ہیں غلط ...
کوئی زمیں نہیں ایسی جہاں مزار نہیں

مقر دل میں تو دشمن زباں سے ...
ہر جو شکل کے نکل جائے کیا نکالیں نہیں

غزل کہی ہے کہ ... ...
وہ کون شعر ہے جو ... ہوا نہیں

۱۰۳ ——— ۱۷

نہ اہل دل سے نہ اہل نظر سے پوچھتا ہوں
خبر وہاں کی ہر اک بے خبر سے پوچھتا ہوں

وفور شوق میں کھویا گیا ہوں میں ایسا
کہ نامہ لکھ کے پتہ نامہ بر سے پوچھتا ہوں

بتا یہ خواب کا عالم ہے یا ہے بیداری
یہ اپنی چشم حقیقت نگر سے پوچھتا ہوں

کوئی خبر نہیں دیتا ہے خاک جم کی مجھے
میں خشت گر سے کبھی کوزہ گر سے پوچھتا ہوں

میں وہ ہوں گردش کارواں قد آدم
کہ رہروؤں کا نشاں رہ گذر سے پوچھتا ہوں

اسی طرح مری آغوش سے اٹھا تھا کوئی
تڑپ تڑپ کے یہ درد جگر سے پوچھتا ہوں

عبث ہی خضر اگر ساتھ ہو لئے میرے
کہیں میں اس کا پتہ راہ بر سے پوچھتا ہوں

کرشمہ اس کی نگہ کے کسی سے کیوں پوچھوں
یہ اپنے دل سے یہ اپنی جگر سے پوچھتا ہوں

ملا نہ نقش قدم تو رہرووں کا پتہ
میں اب غبار سر رہ گذر سے پوچھتا ہوں

بھرا ہے جام صبوحی کا شاخ گل کی طرح
پتہ چمن کا نسیم سحر سے پوچھتا ہوں

شجر ہیں وجد میں کیوں گل ہیں کس لئے نچود
یہ حال بلبل شوریدہ سر سے پوچھتا ہوں

ہنوز سر حقیقت کا ذوق باقی ہے
جواب کچھ نہ ملا عمر بھر سے پوچھتا ہوں

جگر تھا میرا ابھی کیا وہ کب ستم کے لئے
یہ آج قاتل بیداد گر سے پوچھتا ہوں

بتا تو عشق کا انجام ہوگا کیا اے نظم
مآل کار کو میں پیش تر سے پوچھتا ہوں

۱۰۴ ——— ۱۸

جو دل کو پیس کے پھینکیں تو آرزو نہ کریں
جو پاؤں کاٹ کے بیٹھیں تو جستجو نہ کریں

وہ جا کے باغ میں غنچہ کا دل لہو نہ کریں
شہید سرو چمن کو کنار جو نہ کریں

نکالیں تیغ کہ یک سو ہو روز کا جھگڑا
رقیب مجھ سے لگی لپٹی گفتگو نہ کریں

وہ اشک کیسے پھپھولے نہ جن سے پڑ جائیں
وہ داغ کیسے کلیجہ کو جو لہو نہ کریں

کہیں ہزار میں حق ہم وہ تیغ عریاں ہیں
کسی کا منہ نہ کریں پاس آبرو نہ کریں

جناب شیخ کے زہد و ورع کو دیکھ لیا
کٹیں یہ ہاتھ جو اب بیعت سبو نہ کریں

گلہ نہ شکوہ کہ وہ لب سے لب ملائے ہیں
دہن پہ مہر یہ کی ہے کہ گفتگو نہ کریں

قسم یہ دیجیے میں کہتا ہوں آرزوؤں سے
مرا لہو پئیں دل اگر لہو نہ کریں

حریف نکلے نہ چھریاں لگائیں بس مجھکو
شراب حلق سے اترتی ہوئی لہو نہ کریں

وہی ہے سامنے مڑ کر جدھر جدھر دیکھو
وفور شوق میں کیوں سجدہ چارسو نہ کریں

مرا غبار یہ اٹھ اٹھ کے کہتا ہے سر راہ
کہ پاؤں چلتے ہوں ور تیری جستجو نہ کریں

گناہ گار کو آتی ہے منہ دکھاتے شرم
ہماری لاش کو احباب قبلہ رو نہ کریں

وہ پاک عاشق شوریدہ سر ہوں میں کہ کبھی
حسین جہاں کے مرا ذکر بے وضو نہ کریں

جو دل پہ رکھیں تو رکھیں نہ دل میں کوئی ہوس
جو دل کریں تو کسی شے کی آرزو نہ کریں

جہاں کو رہ گذر عاریت اگر سمجھیں
مقام پھر کوئی دم مثل آب جو نہ کریں

ملا ہی یہ گل صد برگ سی سبق ہم کو
ہزار بھی ہوں زبانیں تو گفتگو نہ کریں

نماز میں نہ ہمیں قتل نفس ہو منظور
تو آستین الٹ کر کبھی وضو نہ کریں

نکل گیا کسی صحرا میں نظم آخر کار
جو یوں گیا اسے جانے دیں جستجو نہ کریں

۱۰۵ ———— فاعیل فاعلات م فاعیل فاعلات ———— ۲۰

چھلکی ہے چاندنی سے دل پاکباز میں ہے داغ سجدہ چاند جبین نیاز میں
آئی تھی بوئے ناز جو عرش نیاز میں خاموش مثل شمع ہوں سوز و گداز میں
کچھ مجھ کو یہ خیال بھی ہے مشق ناز میں پامال ہوگیا کوئی اس ترک تاز میں
جو شوخیاں ہیں خامہ افسوں طراز میں وہ خوبیاں نہیں ہیں بتان طراز میں
ڈھیلے پڑے ہیں بند قبا خواب ناز میں نقد وصال ہے گرہ نیم باز میں
نیچی نظر ہے شرم کی اونچی ہے تھر کی بچتا نہیں شکار نشیب و فراز میں
دل لیکے بھول جانیکی عادت ہے آپ کو اب کے گرہ لگائے زلف دراز میں
دل میرا اس طرف ہے ادھر دل رقیب کا دونوں کو تولیے نظر امتیاز میں
بے پردہ ہوگیا ہے تجلی سے حسن یار ہے طاقت نگاہ کسی دیدہ باز میں
تیری زباں سے آگ لگی شمع انجمن میری زباں کو دخل نہیں میری راز میں
تقدیر کے لکھے کو نہ ہرگز برا سمجھ لغزش محال ہے قلم کارساز میں
پردہ میں نغمہ زن ہے تو دھوکا ہے گیا ہے جسم میں یہ سوچ کہ آہنگ ساز میں
کہتی تھی آج شمع سحر مجھ کو دیکھ کر جیسے ہو کس طرح سے غم جانگداز میں
پھانسی لگا رہی ہے اجل کیا بری طرح الجھا کے رشتہ ہائے امید دراز میں

ہوں میں تو ناتواں مجھے کیونکر نہ خوف ہو / پھنستے ہیں شیر دام گر حرص و آز میں
خالی نہیں فریب سے عیش اس جہاں کا / ساغر شراب کا ہے کف شیشہ باز میں
اس بحر پر خطر میں نہیں جس کی موج سے / ڈر کر ہوا سوار تلاطم جہاز میں
وہ صید پر شکستہ ہوں پائی ہے جس نے بار / میں نے ہوائے بال و پر و شاہباز میں
تسبیح او سے بعد پڑھی بھی تو کیا حصول / سو مرتبہ خدا کو جو بھولا نماز میں
تھا طاعت خدا میں بھی یہ حال نظم کا / تصویر ایک کی رہی جا نماز میں

۱۰۶ —————— ۱۵

مبرم قضا سے عشوہ سحر آفریں نہیں / جادو کی ہے یہ وہ نگہ شرمگیں نہیں
وہ دن ہے کونسا کہ میں اندوہگیں نہیں / ہے دل تو سب کے پاس یہ آفت کہیں نہیں
رکھتے کہیں ہو پاؤں تو پڑتا کہیں ہے یہ / سنبھلو زمیں ہے فلک متیں نہیں
چنبر کی طرح رنگ بدلتا ہے آسماں / کیونکر کہوں کہ نالہ دل آتشیں نہیں
او تنگ دل یہ ہاتھ خزانہ کا سانپ ہے / افعی کی کینچلی ہے تیری آستیں نہیں
سر میں بھرا ہوا ہے تیری بادہ غرور / موج شراب ناز ہے چین جبیں نہیں
سرمہ سے کر دیا ہے سخن گو غزال کو / کم سامری سے غمزہ سحر آفریں نہیں
پینے میں خون دل کے حلاوت کمال کی / حیراں ہوں شکر ہے یہ انگبیں نہیں
جنت میں لطف کوچہ دلدار کا سہی / لیکن وہاں مزار کے قابل زمیں نہیں
کہتا ہے حال قبر کا دوزخ کا خلد کا / واعظ کے سر پہ تو کہیں روح الامیں نہیں

مجھ سا گناہ گار سزا وار لطف ہو
جنت بھی مل چکی مگر اب تک یقیں نہیں

نالے اگر کئے تو اڑاؤں گا خاک میں
یا آج آسماں نہیں یا زمیں نہیں

چھپ کے جا نکلے ہجر کی شب میں تو کس طرح
او جھل ذرا نگاہ سے وہ مہ جبیں نہیں

دوزخ میں میں ہلاک کے پکاروں گا یا کریم
آئے نہ تجھکو رحم یہ ہرگز یقیں نہیں

اے نظم کون حسن کسی سے چھوٹ رہا
۱۰۷ —— قرآں اٹھائے شیخ تو ہم کو یقیں نہیں —— ۱۴۳

کیا ہو یقیں ملیگا وہ ہم کو یہاں کہیں
اپنا ہی اس جہاں میں پتہ یا نشاں کہیں

مژگاں تری سی تجھکے چلے اے امیر شتاب
ڈرتا ہوں اڑ نہ جائیں تری چھتیاں کہیں

یارب وہ تیرگی شب غم کی ہوئی نمود
سنجائے یہ سمٹ کی نہ بیل دواں کہیں

سمجھے تھے ہم کہ سجدۂ طاعت ادا کیا
دیکھا تو سر کہیں ہے ترا آستاں کہیں

گنبد میں آسماں کے چھپا تھا قضا سے میں
کیا جانتا تھا یہ نہ ملے گی اماں کہیں

باتیں بنا نا کے وہ مکرے تو کیا عجب
جس نے کہ ایک بات میں سو مکریاں کہیں

وقت غروب شمس سے ناز کسر ہو ڈر پہ ہے
پتھر کی سل بنے نہ یہ خواب گراں کہیں

کیا سر کے بل گئے ہیں عدم کی سفر میں لوگ
اس راہ میں قدم کا نہ پایا نشاں کہیں

آواز ایک کی نہیں جا سکتی ایک تک
نالاں نہیں کہیں یا جرس کارواں نہیں

لے چل مجھے بھی او شب عشرت تو اپنے ساتھ
ڈرتا ہوں میں قصاص نہ لے آسماں کہیں

دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا
بھڑکی کہیں نہ آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

عالم یہ سحر میں ہے کہ بیٹھی کہیں میں ہم | اول ہی کہیں خیال کہیں ہے گماں کہیں

اے نظم سائنٹ کلکٹر ہے تو کیا ہے غم

ہاں دیکھنا پلٹ کے نہ کاٹے زبان کہیں

۱۰۸ ——— ۱۵ ہیں

۱ تیور قدم قدم پہ مجھے آئے جاتے ہیں | اور دل کے ولولے ہیں کہ دوڑے اٹھائے جاتے ہیں

۲ صف کارزار گرم بنا کاکلوں سے تو | وہ سانپ ہیں کہ دوش پہ بل کھائے جاتے ہیں

۳ کیا پھر پڑا رہا ہے دل نار رشک سے | وہ مرغ نامہ بر کو جو پر کاٹے جاتے ہیں

۴ آہ آسماں پہ جا کے لگی لگاتی ہے | تلے فراز عرش کو تھرائے جاتے ہیں

۵ گویا لگا گیا ہے ستاروں میں آفتاب | جتنے حسین ہیں سب وہیں جھلکے جاتے ہیں

۷ دیوانہ میں ہوا اب کہ میں ناصح کو بتائے | سمجھ نہ سمجھے کوئی وہ سمجھائے جاتے ہیں

۸ آنکھوں میں تیری رہتی وہ دل میں سما گئے | پائی جگہ تو پاؤں کو پھیلائے جاتے ہیں

۹ بیٹھا تو اس ادا کا میں اہل کرم کی ہوں | دستی میں اپنے آپ ہی شرمائے جاتے ہیں

۱۰ تھا دیکھنا ترے بام بلند کو | پھیر فلک کی آج تلک آئے جاتے ہیں

۱۱ بیچو کریا سحر ہنڈولے میں چرخ کے | ہم دور ہی سے دیکھ کے تو بولائے جاتے ہیں

۱۲ پھرتی سوال کرکے نکلیں دو تنگ میں | حاضر جواب وہ کہ گھبرائے جاتے ہیں

۱۳ یا رب یہ جو بال ہے دریش ہے وہ راہ | اور پاؤں مارے خوف کے تھرائے جاتے ہیں

۱۵ باندھو کمر یہ ٹھہرنے کی جا نہیں | ہم چلتے چلتے بات یہ سمجھائے جاتے ہیں

سب قافلہ تو جا بھی چکا نظم اب تو چونک ۱۶
ایسے میں کچھ نشان قدم پائے جاتے ہیں

۱۵ مفعول فاعلاتن دوبار ۱۰۹

اس واسطے عدم کی منزل کو ڈھونڈتے ہیں
مدت سے دوستوں کی محفل کو ڈھونڈتے ہیں

یہ دل کے پار ہو کر پھر دل کو ڈھونڈتے ہیں
تیر نگاہ اس کے بسمل کو ڈھونڈتے ہیں

اک لہر میں نہ سمجھے ہم کیوں اسے حباب دیکھا
یوں آنکھ بند کر کے ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

طرز کرم کی شاہد ہیں میوہ دار شاخیں
اس طرح سر جھکا کر سائل کو ڈھونڈتے ہیں

ہے وصل ہجر اپنا اے قیس طرفہ مضموں
محمل میں بیٹھے ہیں اور محمل کو ڈھونڈتے ہیں

طول امل کا رستہ ممکن نہیں تھا طے ہو
منزل پہ بھی پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

حسرت شباب کی ہے ایام شیب میں بھی
معدوم کی ہوس ہے زائل کو ڈھونڈتے ہیں

اٹھتے ہیں ولولے کچھ ہر بار درد بنکر
کیا جانیے جگر کو یا دل کو ڈھونڈتے ہیں

زخم جگر کا میرے ہے رشک دوستوں کو
مرتا ہوں میں کہ یہ کیوں قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

اہل ہوس کی کشتی یک بام و دو ہوا ہے
دریائے عشق میں بھی ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

آیا جو رحم مجھ پر اس میں بھی چال ہے کچھ
سینہ پہ ہاتھ رکھ کر اب دل کو ڈھونڈتے ہیں

کرتے ہیں کار فرہاد آساں زمیں میں بھی
مشکل پسند ہیں ہم مشکل کو ڈھونڈتے ہیں

اے خضر بے نتیجہ بہر خدا کرم کر
بھٹکے ہوئے مسافر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

دل خواہ تیرے عشوے دل جو ترے اشارے
وہ دل ٹٹولتے ہیں یہ دل کو ڈھونڈتے ہیں

اے نظم کیا بتائیں حج و طواف اپنا
کعبہ میں بھی کسی کی محمل کو ڈھونڈتے ہیں

۱۱۰ کیا کارواں ہستی گزرا رواروی میں ۲۰
فردا کو ہم نے دیکھا گرد و غبار دی میں
تھے محو لالہ و گل کس کیف بیخودی میں
زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹے ہنسی ہنسی میں
یاران بزم عشرت ڈھونڈوں کہاں میں تم کو
تاروں کی چھاؤں میں یا پچھلے کی چاندنی میں
ہر عقدہ میں سما ہے پوشیدہ ہے کشائش
ہے موج خندۂ گل پنہاں کلی کلی میں
زخموں میں خود چمک ہے اور اس پہ یہ ستم ہے
رنگ پریدہ سے میں رہتا ہوں چاندنی میں
ہم کس شمار میں تھے پرسش جو ہم سے ہوتی
یہ انتہا نہ پایا آشوب آگہی میں
حکم قضا ہو جیسا سرزد ہو فعل ویسا
بندہ کا دخل بھی ہو پھر اس کی بندگی میں
رفتار سایہ کو ہے پست و بلند یکساں
ٹھوکر کبھی نہ کھائیے راہ فروتنی میں
وجد آگیا فلک کو غش آگیا زمیں کو

دو طرح کے اثر تھے اک صوت سرمدی میں
تعبیر اس کی شاید ایک ابہیں نفس ہو
جو خواب دیکھتے تھے ہم ساری زندگی میں
لائی حباب تک کو سیل فنا بہا کر
اک آہ کھینچنے کو ایک دم کی زندگی میں
محشر کی آفتوں کا دھڑکا نہیں رہا اب
سو حشر میں نے دیکھے دو دن کی زندگی میں
پہلو میں تو ہو اے دل پھر حسرتیں ہزاروں
کس بات کی کمی ہے تیری سلامتی میں
پرسان حال وہ ہو اور سامنے بلا کر
کیا جانئے زباں سے کیا نکلے بیخودی میں
تو اک طلسم ہستی پھر کیسی خود پرستی
سایہ کی پرورش ہے دامان بیخودی میں
حائل بس اک نفس ہے محشر میں اور ہم میں
پردہ حباب کا ہے فردا میں اور دی میں
آنکھیں دکھا رہی ہے دن سے مجھے شب غم
آثار تیرگی کے ہیں دن کی روشنی میں

تو نے تو اپنے در سے مجھ کو اٹھا دیا ہے

پرچھائیں پھر رہی ہے میری اسی گلی میں

سجدہ کا حکم مجھ کو تو نے تو اب دیا ہے

پہلے ہی لکھ چکا ہوں میں خط بندگی میں

اے ظلم پیشہ گر ہم تجھ کو ہوئے پشیماں

کیا جانتے تھے ظالم رو دیگا دل لگی میں

١١١ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ١١

صبح غم کی یہ شعاعیں نشتر سے کم نہیں

چاک داماں سحر چاک جگر سے کم نہیں

حسن کی ترکیب دیتی ہے گلستاں کا جواب

قد شجر سے کم نہیں اعضا ثمر سے کم نہیں

زلف کا چہرہ پہ آنا ہے ستم ہنگام دید

ایک لمحہ بھر بھی مجھکو رات بھر سے کم نہیں

جھک گیا ہوں ضعف سے گردش ہی قسمت میں ہے

پاؤں کا چکر مرا دستار سر سے کم نہیں

میری ازخود رفتگی بے روئے کم ہوتی نہیں

آپ میں آنا بھی دریا کے سفر سے کم نہیں

سجدہ کرتا تھا وہاں میں سر ٹپکتا ہوں یہاں
آستانِ یار بھی کعبے کے در سے کم نہیں

کیا بتاؤں بادیہ پیما ہوں میں کس راہ میں
پاؤں میں جو آبلہ ہے وہ گہر سے کم نہیں

بل پہ بل کھانا ستم کا ہے بلا کا پیچ و تاب
بال بال اس زلف کا موئے کمر سے کم نہیں

اس میں رہتا ہے کسی کے روئے روشن کا خیال
خانۂ دل اپنا آئینے کے گھر سے کم نہیں

انتہا رکھتا نہیں ہے گو شبِ فرقت کا طول
لیکن اپنا رنگ اڑ جانا سحر سے کم نہیں

سنگ پہ منہ رکھ کر جو رویا پہنچے گوشِ یار تک
نظمؔ اپنا ایک ایک آنسو گہر سے کم نہیں

۲۵ ۱۱۲

یاس و امید اس طرح ہے خاطرِ دلگیر میں
ہو اندھیرا اور اجالا جس طرح تصویر میں

دم بھی لے سکتا نہ انساں گردشِ تقدیر میں
گر کشش ہوتی نہ اتنی خاکِ دامن گیر میں

بارہ پیدا آنکھ کے برسنے کی شمشیر میں
دیکھئے پلکوں کی صف نے پر لگائے تیر میں
دم نہیں ہے صیدگاہ حسن کے نخچیر میں
آرزوئیں دل میں ہیں دل ہے کسی کے تیر میں
ہو چکے ہیں خاک دونوں ہے ہوا چلنے کی دیر
صلح ہو جائیگی اب دارا و عالمگیر میں
عشق سکھلاتا جو یک روح و دو قالب کا عمل
جان اپنی ڈال دیتے ہم تری تصویر میں
صید کے دھوکے میں کیا جانے کیا تھا کس کو قتل
ڈال دیں قاتل نے باہیں گردن نخچیر میں
ابروؤں میں تیرے ظالم اور کماں میں فرق ہے
کام ہوائے اشارہ میں تو اس کے تیر میں
رات کو تارے کھلے تھے صبح کو کلیاں کھلیں
واشد خاطر نہ تھی اک میری ہی تقدیر میں
وصف تیرا ایک سے بھی ہو نہیں سکتا بیاں
ہے زباں تقریر میں عاجز قلم تحریر میں
خرمن صبر و سکوں کی یاالٰہی خیر ہو

آج بجلی کی چمک ہے آہِ بے تاثیر میں

کعبہ و بت خانہ عارف کی نظر سے دیکھئے
خواب دونوں ایک ہی ہیں فرق ہے تعبیر میں

اس کی ایک ایک بات کو دیتا ہوں میں سو سو جواب
طول موسیٰ نے دیا تھا جس طرح تقریر میں

آپ سے ہو کر مخاطب میں ایسا ہو گیا
غرض مطلب کو میں بھولا لذتِ تقریر میں

میں اگر زنداں سے اٹھا جان لے محشر اٹھا
اے جنوں شورِ قیامت ہے میری زنجیر میں

کہکشاں کے حلقہ سے یہ مضموں ہے عیاں
باندھ کر رکھا ہے فیلِ مست کو زنجیر میں

جس قدر تڑپا اسیری اس قدر بڑھتی گئی
طوق آخر کو الجھ کر رہ گیا زنجیر میں

سر جو ٹکرایا تو دیواروں کو زنگیں کر دیا
ایڑیاں رگڑیں تو ...... صیقل ہو گئی زنجیر میں

کم نہیں رختِ عروسی سے محرم کا لباس
لاکھ زیور کا مزہ ہلکی سی اک زنجیر میں

کھل پڑے گیسو تو بند ہنا اک مصیبت ہو گیا
زلف مشکل میں کبھی اولجھی کبھی زنجیر میں

زلف کے سودے میں آیا اوسکی آنکھوں کا خیال
اور دو حلقے زیادہ ہو گئے زنجیر میں

ہو رہی ہے قصر تن کی مہر و مہ سے پرورش
اوٹھ رہی میں درہم و دینار اس تعمیر میں

بڑھ کے کاجل سے بھی تجھ کا جل کا لگنا ہے ستم
سرمگیں آنسو لگا دیتا ہے پیکاں تیر میں

اس نے دیکھا جب لگا کر دانت پر تلوار کو
آب گوہر مل گئی آب دم شمشیر میں

تجھ سے ہم کہتے تھے اے ظالم ستم سہہ اُف کر
ہو گیا کفران نعمت شکوہ تقدیر میں

۲۲ ۱۱۳

نور دل سے عشق کے بے پردگی ہوتی نہیں
اک چمک اوٹھتی ہے لیکن روشنی ہوتی نہیں

آئینہ دار خیال یار ہے جوش سرشک
کون سا شیشہ ہے وہ جس میں پری ہوتی نہیں

سوگئے اوٹھنے کا ترے کچھ اور ہی انداز ہے
اس طرح خورشید کی توری چڑھی ہوتی نہیں

جلنے والے جل کے رہ جاتے ہیں کیسا دیکھکر
صبح کو ہونٹوں پہ جب شب کی مسی ہوتی نہیں

کیا کہوں میں توڑتا شیشے سے ٹکرا کر اوسے
تو یہ زاہد بوقت میکشی ہوتی نہیں

وصل کی شب دل ہے میرا اور کسی کی کروٹیں
دیکھوں تو پامال حسرت کونسی ہوتی نہیں

شکوہ بیداد پر کیا ہو تلافی کی امید
ناز ہوتا ہے اوسے شرمندگی ہوتی نہیں

آنکھ بھر کر دیکھنے سے اوس کے جو ہوتا ہے حال
ساغر سرشار سے یہ بیخودی ہوتی نہیں

دیدہ حیراں کے آگے ہوتی ہیں جو شوخیاں
محرم اس ناز وادا سے آرسی ہوتی نہیں

ہے شب غم میں زمانہ میری نظروں میں سیاہ
کہہ رہا ہوں آج اب تک روشنی ہوتی نہیں

گوشہ عزلت ہے جز رو مدِ عالم سے الگ

غم یہاں مرنے کا جینے کی خوشی ہوتی نہیں
یہ مرض ہستی کا اے خضر اور بے رہبر تم
پی گئے آبِ بقا اب زندگی ہوتی نہیں
دل اٹھا لینے میں دنیا سے وہ ملتا ہے غنو
اہل دل کو اس سے بہتر دل لگی ہوتی نہیں
دولت کونین ملتی ہے جو طالب ہوں ابھی
اپنی ہمت ہی کہ اب تک ملتجی ہوتی نہیں
شبنم و گل برق و باراں جام و مینا کا ہی ساتھ
کس کے رونے پر زمانے میں ہنسی ہوتی نہیں
مل کے ابنائے زمانہ سے ملے کیا مجھ کو لطف
دوستی ہمتی نہیں ہے دشمنی ہوتی نہیں
آسیائے چرخ ہے مدت سے اور عظم رمیم
قسمت اجزا ابھی تک منتہی ہوتی نہیں
سیدھی سادی راہ کوئی بیکسی کی راہ ہے
بیچ میں دیوار گر دنیا کسی ہوتی نہیں
آئینہ کی طرح سب سے دل کو میرے تھا ہوا صاف
خوب ہو یا زشت مجھ سے بیرخی ہوتی نہیں

غیر ممکن ہے کہ یک دل یک زباں ہو ساری خلق
جب کہ دو شخصوں کی صورت ایک سی ہوتی نہیں

پڑ گیا ہے پھیر کتنا معرفت کی راہ میں
دوڑتے سب ہیں رسائی ایک کی ہوتی نہیں

اس زمیں میں اور کچھ اشعار رندانہ سنا
نظم اہل ذوق کو سیری ابھی ہوتی نہیں

۱۲ ۱۱۴

دل نہ ہوتا گر تو پھر کچھ دل لگی ہوتی نہیں
غم کبھی ہوتا نہیں حسرت کبھی ہوتی نہیں

لوٹتے رہتے ہیں تجھ پر جلنے والوں کے دل
ورنہ یوں پوشاک تیری ملگجی ہوتی نہیں

دور میں فصل خزاں کے آشیاں سے کیا غرض
پھونک دیتے ہم اگر بجلی گری ہوتی نہیں

کاتباں نامۂ اعمال نے دھرا دیا
ہم لکھا جاتے اگر لکھا پڑھی ہوتی نہیں

دل رہین عشق ہو کر مال ان کا ہو گیا
پھیر لیتے ہم اگر آئی گئی ہوتی نہیں

ہجر کی تاریک راتیں تھیں جو قسمت میں مری
کاشکے یہ چار دن کی چاندنی ہوتی نہیں

خون پی کر غم نہ کر دیتا اگر صید زبوں
اے اجل تجھ سے کبھی شرمندگی ہوتی نہیں

در کھلے ہیں آسماں کے مے پرستوں کے لئے
ورنہ یوں تکلیف از خود رفتگی ہوتی نہیں

ہو گیا رنگ تعلق مانع سیر و سلوک
دوڑتے گر پاؤں میں مہندی لگی ہوتی نہیں

پھر اگر بیچا خزاں سی جھک کے ہم کرتے سلام
سرو گلشن میں جو اتنی راستی ہوتی نہیں

ملنے والا تھا دل حسرت زدہ جس دن مجھے
کاش عالم میں وہ ساعت وہ گھڑی ہوتی نہیں

نظم جب تک ہو سکے ترک تشخص چاہیے
ہم خدا تجھ کو سمجھتے گر خودی ہوتی نہیں

۱۱۵ وله ۹

حرص را خون کردن و دل را توانگر داشتن
این عمل کم نیست از کبریت احمر داشتن

نسخهٔ تسخیر دلهای جهان دانی که چیست
حرف شیرین و زبان لعل موج کوثر داشتن

ای که میداری سفر در پیش و منزلها جهان آمدن
زاد راه آنست دل از اهل جهان بر داشتن

تا نهادستی جبین عجز بر خاک نیاز
پس ترا زیباست سر تا آسمان بر داشتن

بر سر آوردن سپیر در انتظار گاه وقت
بهتر است داغ سودائی به کف داشتن

تا توانی دور کن زنگ هوس از خاطرت
ورنه آسان نیست چون آئینه جوهر داشتن

شیشهٔ شک در ره تحقیق میدانی که چیست
خار در پیراهن و نشتر به بستر داشتن

تکیه بر لطف خداوندی که هست آمرزگار
بهتر از اندیشهٔ کردار و کیفر داشتن

دوش احمد هست معراج امیر بت‌شکن
پس چه حاجت اندرون کعبه و منبر داشتن

امن اس دور قمر میں فلک پیر نہیں
ہی کف افعی شب کاسۂ زر تیر نہیں

دل میں سمجھے ہوئے ہیں اپنے کہ ہم بھی کچھ ہیں
خواب وہ دیکھا ہی جسکی کوئی تعبیر نہیں

سیف قاطع ہی یہ نسخہ کہ لئے احکام قضا
ہی بسمل کی تڑپ حیلہ و تدبیر نہیں

آفریں خامۂ رنگین و رنگیں گفتار
عندلیبوں کے ترانے ہیں یہ تحریر نہیں

باغ سبز اپنا دکھا ہمکو نہ اے طول امل
سمجھے بیٹھے ہیں کہ وقفہ نہیں تاخیر نہیں

دم شماری میں گزر جاتی ہی انسانکی عمر
اس میں تقدیم ذرا بھی نہیں تاخیر نہیں

۱۱۷ —— ۲۴

آپ کو میرے دل زار سے کچھ کام نہیں
خیر تو ہیں یہی تکرار سے کچھ کام نہیں

مشغلہ یہ بھی رہا دست جنونکا چندے
اب گریبان کے کسی تار سے کچھ کام نہیں

زمزمہ سے دور جو منہ پھیرے ہوئے بیٹھے ہیں
ہیں مسیحا جنھیں بیمار سے کچھ کام نہیں

رشک نجم سحری ہی ترا آویزۂ گوش
اس ستارہ کو شب تار سے کچھ کام نہیں

مجھکو طوطی کیطرح ذوق نواسنجی ہے
ورنہ آئینۂ رخسار سے کچھ کام نہیں

وعظ کہنے کو چلے آئے ہیں میخوار و نہیں
شیخ کو خانۂ خمار سے کچھ کام نہیں

ابر کی طرح سبک روح گذر جاتے ہیں
خلش وادی پرخار سے کچھ کام نہیں

شعلۂ شمع نہیں ہوں میں ہوں دلِ ناداں تسنیم
مجھکو خار سر دیوار سے کچھ کام نہیں

قلزم عشق کا پیراک نہیں میں نہ سہی
ڈوب مرنا ہی تو منجدھار سے کچھ کام نہیں

کھلتا ہی راز نہاں آتش جاں سوز ہوں میں
اور زباں کہتی ہی اظہار سے کچھ کام نہیں

آنکھ بھر کر نگہ مست سے وہ دیکھے تو یہ | مجھے ساغر سرشار سے کچھ کام نہیں

تیغ کھینچے ہوئے رہتی ہے ادا ہر لحظہ | ہے ستم یہ کہ گنہگار سے کچھ کام نہیں

نفس بد کیا مجھے دنیا کی طمع دنیا ہے | تیسرے فاقہ بھی مردار سے کچھ کام نہیں

ہیں طلبگار تجلی نہیں موسیٰ کی طرح | آتش لالۂ کہسار سے کچھ کام نہیں

مرکز صبر و سکوں زیر قدم ہے اپنے | گردش گنبد دوار سے کچھ کام نہیں

سعد و نحس اپنا ہی اپنا ہی سکون و حرکت | کوکب ثابت و سیار سے کچھ کام نہیں

اپنا منہ اشک ندامت میں نظر آتا ہے | مجھ کو آئینۂ دیدار سے کچھ کام نہیں

اس کو بھرتی ہوئی دیکھا تھا الٰہی جو شاید | گر گئے سرو کی رفتار سے کچھ کام نہیں

اس کے جانے ہی چلی جاتی ہی بھی گھر سے مرے | کہ مجھے اب در و دیوار سے کچھ کام نہیں

نیند آتی ہی تو یہ کہکے چلی جاتی ہے | کہ مجھے دیدۂ بیدار سے کچھ کام نہیں

سوچ ماری ہو غم دل تو فلک تک پہنچے | اس کو لیکن لب اظہار سے کچھ کام نہیں

رہزنی میں زن دنیا کا سلیقہ دیکھو | کہ اسے مرد سبکبار سے کچھ کام نہیں

کہہ دیا منکر رویت ہیں ناقہموں نے | طالب وصل ہیں دیدار سے کچھ کام نہیں

میں جگر بند پیمبر کا ہوں شیدائی نظم
پسر ہند جگر خوار سے کچھ کام نہیں

۱۱۸ ———— ۱۰

کچھ غبار دل شیدا کی خبر ہے کہ نہیں | نظر آئینہ پر دانہ دھرے ہے کہ نہیں

بزم ہونے کو ہے برہم یہ خبر ہے کہ نہیں
دیکھنا رات کچھ اب شمع سحر ہے کہ نہیں

ناز کیجو نہ گریہ ہو گیسو کو تو بڑھ کر دیکھے
لب وہی ہائے تپ جھلا ہی مگر ہے کہ نہیں

پھر وہ وقت ہم گلے اس کے لگا دیکھو
پھول میرے گور پہ کچھ قسم درد گاہ ہے کہ نہیں

تجھ کو نالوں سے ہو فرصت تو پوچھوں بلبل
دل لگا کو کہ زمانے میں ٹھہرے کہ نہیں

ہے شب عشق کو ماتم میں فلک کو شستہ
دیکھو تو کیا کہ گریباں سحر ہے کہ نہیں

رات پھر اشک سے تاکا نہیں کچھ تقصیر
[illegible] گریباں اثر ہے کہ نہیں

تم ہی تو آ کے پھر اس زلف میں تو دیکھو
آج اس چشم سیہ بخت کی نظر ہے کہ نہیں

اور جو راز تجھے پنہاں وہ کہا وصل کی بات
[illegible] معلوم ہوا ہم کو خبر ہے کہ نہیں

ہائے افسوس ظفر کہنا مرا مانا نہ سہی
یار جو آیا پھر وحشت میں ظفر ہے کہ نہیں

۱۴۹

خم گیسو میں دل زار کو ہم دیکھتے ہیں
کس شکنجے میں گنہگار کو ہم دیکھتے ہیں

پھر نکلتی ہی نہیں آنکھ سے چھلنی میں سمائی
پھر وہ قدرت ترے اقرار کو ہم دیکھتے ہیں

لیے سیر چمن اس میں نہیں لطف بجز خار
ساتھ تیرا سیر گلزار کو ہم دیکھتے ہیں

کھڑی غیر اس کے جو ستاں نظر آتا ہے
کس نظر سے در و دیوار کو ہم دیکھتے ہیں

ہائے کیا ہو گیا موقوف فلک کا پھرنا
ایک مدت سے شب تار کو ہم دیکھتے ہیں

اپنے قابو میں جو آجا دل زار اپنا
پھر تری گرمی بازار کو ہم دیکھتے ہیں

صبح نو سر سے چمکنے ہی ہو گی لیکن   آج گرتے ہوئے دیوار کو ہم دیکھتے ہیں

نظم اب ترک محبت کا زمانہ ہے قریب
اور جانب نگہ یار کو کم دیکھتے ہیں

٢١ — مفاعیلن چار بار — ١٣٠

نفس جب تک ہے آنکھیں دیدہ وا دید جہاں کر لیں
بندھا ہے تار جب تک تماشا پتلیاں کر لیں
اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں
نفس کو خوں فشاں کر لیں یا قفس کو بوستاں کر لیں
کہ اپنا سخندانی سے گردوں منفعل کر دے
جو کہنا ہو وہ کہہ سن لیں جو کرنا ہو بیاں کر لیں
سفر تو اس قدر ہو دور کا اور پھیر کا رستہ
مناسب تھا کہ پئے ناقہ کو محمل کو گراں کر لیں
حسینوں کی بہار حسن ہے مہمان دو روزہ
ادائیں گرمیاں کر لیں نگاہیں شوخیاں کر لیں
ضعیفی میں نہیں ہمکو شکایت قد کے جھکنے کی
زمیں سے کچھ تو ہوں فریاد جور آسماں کر لیں
غرض ہے کسب عرفاں مجھکو میخانہ میں آنے سے

جنھیں طوفاں اٹھانا ہو وہ جو چاہیں گماں کر لیں

نہ آنا اے اجل تجھ کو قسم ہے وقتِ آخر تک
ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائیگاں کر لیں

خضر کو فاتحہ دینی ہے گر ہم خاکساروں کی
تو پہلے چشمۂ آبِ بقا سے کلیاں کر لیں

خبر اس کی نہیں تھی دام زیر کاہ پنہاں ہے
ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آشیاں کر لیں

ہمارے ضبط کی گر پردہ داری دیکھنا چاہے
تو آ اے برق تجھ کو آشیاں میں ہم نہاں کر لیں

عجب کیا گر نہیں ملتا مرے سینہ میں تیر اُن کا
وہ ناوک پر قیاس معنی خاطر نشاں کر لیں

نہ ہو کوئی ہنر انساں میں اک شیریں زبانی ہو
یہ افسوں پڑھ کے دشمن کو بھی ہم تو مہرباں کر لیں

ہماری رندی و مستی تو قابل منع کے ٹھہری
سر منبر بھلا واعظ تو ٹھنڈی گرمیاں کر لیں

سمجھتے ہیں کہ جینا نزع کی حالت میں بھی اچھا
جو بس ہو تو اجل کو کچھ دنوں ہم میہماں کر لیں

بھلا کیا فائدہ اہل جہاں سے ہم سخن ہو کر
اثر اتنا تو ہو آخر کسی کو ہم زباں کر لیں

ہمیں اس بزم میں درد محبت گر نظر آئے
کلیجہ میں چھپا لیں اس کو آنکھوں سے نہاں کر لیں

مسیحا اُٹھ۔ لے بالیں سے ذرا بھی تم رہا اور تو ہے
ٹھہرا ہے درد دل اتنا کہ ہو درد دل بیاں کر لیں

چلا میں بزم سے پھر ذکر میرا نا مناسب ہے
شکایت میری جو کرنا ہو مجھ سے مہرباں کر لیں

ہوا ہے جب کہ ثابت عیش دنیا کا خیالی ہے
خیال عیش سے لازم ہے دل کو شادماں کر لیں

خزاں کے خوف میں گھلنے سے یہ اے نظم بہتر ہے
تماشائے گل و ریحان و باغ و بوستاں کر لیں

۱۲۱ ۲۰

گزرتے ہیں تو مثل سیل عالم سے گزرتے ہیں
ٹھہرتے ہیں تو مثل نقش پانی پر ٹھہرتے ہیں
صبا کی طرح پھیرا کوچۂ ہستی کا کرتے ہیں
کہ آزادانہ آجاتے ہیں مستانہ گزرتے ہیں

[illegible] مستی کی تو کیا تو نے مگر یا رب

لگا دیتے ہیں تہمت جیسے [illegible] دھرتے ہیں

[illegible] آپ [illegible] ہوا [illegible] ہے

کہ گرمی سے پگھل جاتے ہیں [illegible] سردی [illegible] ٹھٹھرتے ہیں

وہ کیا جانیں [illegible] لذت [illegible] قناعت کی

کریں [illegible] حلق سے کیونکر اترتے ہیں

[illegible] تہمت

کوئی مرنے سے ڈرتا ہوگا ہم جینے سے ڈرتے ہیں

[illegible] ٹوٹی تو کچھ زاہد

شکست [illegible] کا الزام ہم شیشہ پہ دھرتے ہیں

[illegible] دنیا کے [illegible] ہو کیا خبر ان کو

کہ [illegible] پھول [illegible] بکھرتے ہیں

یہ عادت کیا انہوں نے سیکھ لی ہے [illegible]

کہ جس پر آنکھ پڑتی ہے اس کو نام دھرتے ہیں

مروت تو [illegible] نہیں اچھی

ادا [illegible] کہ مرنے دے جو مرتے ہیں

[illegible] شیشے نے [illegible] کو توڑ ڈالا ۱۲

تمھارے گیسوؤں کی برہمی کیا ہم نے دیکھی ہے
بگڑنے سے یہ بنتے ہیں بکھرنے سے سنورتے ہیں

حباب اٹھ کر قرار بحر سے تا سطح آب آیا
ابھرنے والے جو ہیں ناتواں ہو کر ابھرتے ہیں

اگر فقر و غنی کے سلسلہ کو غور سے دیکھو
تو سچ یہ ہے کہ دونوں لفظ بے معنی ٹھہرتے ہیں

قلم سے ذوق سجدہ جادۂ تسلیم میں سیکھو
جو ہیں اہل فنا یوں سر تہ شمشیر دھرتے ہیں

وہ ٹھہرے ہوں دل آئینہ جب تیری صفائی کے یہاں تک
کہیں یہ داغ مٹتے ہیں کہیں یہ زخم بھرتے ہیں

صدا طبل تہی کی ہے یہ شہرت اور یہ آوازہ
ہوا میں بھر کے ارباب ہوس ناحق ابھرتے ہیں

یہی دل ہے تو جینا ہو چکا اب عشق بازوں کا
تماشا ہے کسی کی شکل اچھی ہو تو یہ مرتے ہیں

ضعیفوں کے قد خم گشتہ ظالم وہ کمانیں ہیں
کہ جن کے تیر پشت پیر گردوں سے گذرتے ہیں

لہ قرار بحر دریا کی تہ ۱۲

نہیں ڈرتے زمانہ جتنا چاہے امتحان کرلے
کھرے ہوتے ہیں جو وہ آگ میں گر کر نکھرتے ہیں
پرائے دل کی حالت کو کوئی اے نظم کیا جانے
سمجھتے ہیں وہی جو دل پہ اپنے ہاتھ دھرتے ہیں

١٦ ١٢٢

تری محفل میں جو آتے ہیں کچھ کھو کر نکلتے ہیں
وہ ہر سو ڈھونڈتے اپنا دل مضطر نکلتے ہیں
شگوفے لے کے سر پہ طبلہ عنبر نکلتے ہیں
گل تر ساتھ سلگائے ہوئے مجمر نکلتے ہیں
بہار آئی اوٹھا ہے جوش خون لالہ و گل میں
رگ سودا میں بھی ہم ڈوب کر نشتر نکلتے ہیں
کسی کے مطلع ابرو کو ہم نے پڑھ کے دیکھا ہے
عجب انداز پایا ہے عجب تیور نکلتے ہیں
شب غم اک بلائے بد ہے تارے میں گنوں کیونکر
ستارے بھی کچھ اس کے سایہ سے بچ کر نکلتے ہیں
جنھوں نے دل لگایا ہی نہیں یہ لطف کیا جانیں
اجل کس طرح آجاتی ہے دم کیونکر نکلتے ہیں

نہ پوچھو کاوشِ مژگاں سے تیرے دل پہ کیا گزری
کہ یہ آنسو ہی ٹوٹے ہوئے نشتر نکلتے ہیں

بیابانِ بلا کی راہ سیدھی مل گئی مجھکو
بگولے سیکڑوں کھاتے ہوئے چکر نکلتے ہیں

ہے اس بیمارِ غم کو دھن اوسی محفل میں جانے کی
مسیحا و خضر جس بزم سے مر کر نکلتے ہیں

بھری ہیں صانعِ قدرت نے موتی کوٹکر تجھ میں
عرق جو شرم سے آیا وہی گوہر نکلتے ہیں

جو نا پا تو حسینوں کے قدم تک تھا سرِ محشر
یہ ظالم حشر کے فتنہ سے بھی قد بھر نکلتے ہیں

مری فریاد اور الٹے گلا میرا دباتی ہے
مرے نالے مجھی پر کھینچ کر خنجر نکلتے ہیں

بنائے جلتے ہیں کاجل کے دنبالے دمِ تزئیں
الٰہی خیر ہو تیرِ نگہ کے پر نکلتے ہیں

اشارہ ہی یہی اس شوخ کی ترچھی نگاہوں کا
انھیں گوشوں سے اکثر فتنۂ محشر نکلتے ہیں

نہیں کوشش سے کچھ دیوانگانِ عشق کو حاصل

کنواں کھودیں جو سر سے اس پہ بھی چشمے نکلتے ہیں
متاع صبر و ہوش اے ظلم تو شیوا تو سے لیکر
خبر بھی ہے کہ اس رستہ سی غارتگر نکلتے ہیں

لمہ ۱۳

ثنائے ساقی کوثر جو شعر تر نکلتے ہیں
زبان شعر سے بھی چشمۂ کوثر نکلتے ہیں
غنیمت ہے نفس کے ساتھ جو ہاتھ اٹھ کر نکلتی ہیں
یہ تو ہیں ارمان اپنے دل کے رہ رہ کر نکلتے ہیں
ازل میں نوم ماتم حق مہ و خورشید سے پوچھو
کہ جیب سے یہ نکلتے ہیں برہنہ سر نکلتے ہیں
زباں سے میری گر شکوہ نہیں نکلا نہیں نکلا
اک آہ در شکست رنگ سی و فقر نکلتے ہیں
غبار آئے کسی کے دل میں تجھ سی کیا قیامت ہے
سنا ہوگا کہ اکثر گرد سے لشکر نکلتے ہیں
جہاں کو آئینہ سمجھیں طلسم قدرت حق کا
تو اک ذرہ سے سو بت خانہ آذر نکلتے ہیں
عبرت سی نقصان و کمال ماہ کو دیکھو

۱ یو سہ شکوہ وزہ کے ۱۲

جو پہلے سر پہ ٹوٹتے تھے وہ دل پر بکھر کے نکلتے ہیں
ہوئے ویدلے اڑتی ہے محشر ہو کے کوثر ہو
نفس میلوں میں ہم تخت سلیماں پر نکلتے ہیں
صدائے چنگ سنی مجھکو یہی آواز آتی ہے
یہ کہتا ہے کوئی پردہ سے ہم باہر نکلتے ہیں
گدائے بے نوائی ایک ٹھوکر سے جو گرد اٹھے
ابھی اڑتے ہوئے دارا و اسکندر نکلتے ہیں
وہ ٹھانے ہیں جہاں میں داغ جو ہرگز نہ چھوٹیگا
یہ تیرے چند درہم اے فلک مجھ پر نکلتے ہیں
گذر جاتے ہیں یونہی روز سیہ ارباب ہمت پر
ستارے جس طرح بادل میں چھپ چھپ کر نکلتے ہیں
نشان سوز غم باقی ہو میری خاک میں ابتک
دل پر داغ کے ٹکڑے ہیں جو اخگر نکلتے ہیں
کوئی دیکھے تو پہلے آپ سے باہر ذرا ہو کر
ابھی اس گنبد بے در میں صد ہا در نکلتے ہیں
دل بے آرزو جب سے ملا ہے ظلم حیراں ہوں
کسی کے منہ سے حرف آرزو کیونکر نکلتے ہیں

کھٹک ہر سانس میں ہے ہر نفس کے ساتھ نالے ہیں
کہ دل نازک ہے میرا اور دل کے زخم آلے ہیں

حیا میں ناز بھی ہے منہ پہ وہ آنچل جو ڈالے ہیں
ادا میں شرم بھی ہے اس طرح دامن سنبھالے ہیں

تری محفل میں مجھ سا کشتۂ حسرت نہیں کوئی
اداؤں نے مجھی پر جو چلے دل سے نکالے ہیں

حجاب آتے ہی مژگاں کی صفیں کھنچ جائیں گی باہم
یہ ترکانِ قدر انداز گھونگھٹ کھانے والے ہیں

طریقِ عشق میں ہر ہر قدم ہے کام اے شورش
وہاں پاؤں کے چھالے ہیں جو لوگوں سے چھپالے ہیں

نہ پہونچے فیض اپنوں سے تو شکوہ اسکا کیا کیجے
حبابِ بحر دستِ موج میں خالی پیالے ہیں

نہ ڈھونڈیں گے کہیں اب خانۂ دل کے سوا اسکو
مکاں کعبہ سی لیکر عرش تک سب دیکھے بھالے ہیں

جنھیں تکیہ خدا پر ہو زمیں پہ کیوں قدم رکھیں
مصلے آب پر دوشِ ہوا پر مرگ چھالے ہیں

ملیں وحشت میں جاگیریں مجھے فرہاد و مجنوں کی
گریبانوں کے پرزے کوہ و صحرا کے قبالے ہیں

تری تصویر کو دیکھے ہوئے مدت ہوئی لیکن
مری آنکھوں میں اب تک کچھ اندھیرے کچھ اجالے ہیں

الٰہی رہ گئی تھی خاک میں بھی آہ کچھ باقی
مری مٹی سے جو ساغر بنے ان میں بھی چھالے ہیں

ملال انگیز ہو جاتی ہے افراط طرب آخر
کہ اپنی حد سے نغمے جب گذر جائیں تو نالے ہیں

قلم کی طرح سجدہ ہی کروں میں تو اگر پاؤں
کہاں وہ لوگ ہیں جو بات پر سر دینے والے ہیں

کرم سے اس کے ہیں ساماں کیا کیا بادہ نوشی کے
کبھی ساون کی جھڑیاں ہیں کبھی بھادوں کے جھالے ہیں

وہ ناداں ہیں جو ملک و مال کو اپنا سمجھتے ہیں
کہ یہ آج اس کے قبضہ میں ہیں کل اس کے حوالے ہیں

وہ اب کے سال ہر بوتل کا کاگ اڑتی ہے کیفیت
عمامے زاہدوں نے مست ہو ہو کر اچھالے ہیں

نہ چھوٹی مر کے بھی اہل جہاں سے ظاہر آرائی

کفن کا ٹکڑا ہے کا اوڑنا ہو بستر کے اوپر روشنالی میں

جہاں تو جلوہ گر ہووے ستم شعبدہ افغاں کرنا

تجھے آتا ہے ان پر رحم جو دل کو سنبھالے ہیں

جو پہلے جا چکے اس ظلم میں ان کو تو کیا رو تو

ڈرے ہے جان جاتے ہیں وہ لگ جو میرے ساتھ والے ہیں

١٣ ١٢٥

ہوئی ہے کثرت شور و نوا فصل بہاری میں

کہ بلبل ہنستی ہے نکہت گل کی سواری میں

مجھے فرقت کی شب ہے صبح سے اختر شماری میں

تماشے کہکشاں میں ہیں ترے دیدۂ بیداری میں

گریباں پھاڑئیے گل کی طرح فصل بہاری میں

کہ دم گھٹنے لگا اب تو جنوں کی پردہ داری میں

حباب آسا ہیں ہم اسباب وحشت کچھ نہیں تو

کہ ہووے اعتبار آتی ہے اس بے اعتباری میں

مرے حصے میں جام جم نہ کیونکر اس زم میں آئے

کہ میں بھی تو ہوں یکتا تیرے زمانہ بادہ خواری میں

جنوں بکھیا سکے بہتر ہے کہ ہرگز ہو نہیں سکتا

تغیرِ آبِ راکد کی طرح سے آئینہ داری میں
اوٹھانی کو در و گوہر کے میں ہر اک سے جھکتا ہوں
مجھے کانِ جواہر مل گئی ہے خاکساری میں
اجل نے تو مجھے چھوڑا کہ اک صیدِ زبوں یہ ہے
یہاں دشوار جینا ہو گیا اس شرمساری میں
پشیماں ہونگے تجھکو شاہِ خوباں کیوں کہا میں نے
نہ کی پھر بات ہی مجھ سے غرورِ شہریاری میں
ٹھہر اے سیلِ گریہ ہے جو عکسِ یار کی طالب
صفائی کی ہر صورت غیر ممکن بیقراری میں
غریب آزار کو فرعون اہلِ دل سمجھتے ہیں
وہ تختِ عاج پر نکلے کہ سونے کی عماری میں
ہے اس سفاک کا بھی سامنا محشر میں کرنا
خدا جانے کہوں کیا عالمِ بے اختیاری میں

١٠ ٢٦

ابھی تک بحثِ امکان و مکاں جاری ہے عالم میں
فنا اک دم میں ہو سارا جہاں موجود اک دم میں
یعنی فیضانِ وجود ہر آن میں نہ ہوتا رہے تو عالم فنا ہو جائے آفتاب کی شعاعوں

جوانان چمن اترا نہ جائیں حسن پر اپنے
جہاں کی بے ثباتی آئینہ ہے دست شبنم میں
مری آنکھوں کے آگے تو نہ کر خوں ای اجل انکا
چھپا رکھی تھی میں نے آرزوئیں جان پر غم میں
کرونگی کسی سے مفت سب ممنون منت ہوں
جہاں ڈوبا ہوا ہے چشمۂ احسان حاتم میں
سلیمان جہاں سمجھوں نہ کیوں اہل مروت کو
تبسم ہے لب رنگیں پہ جیسے نقش خاتم میں
حیا دی ہے خدا نے آنکھ میں اہل سعادت کی
نگہ ہے پرورش پائے ہوئے دامان مریم میں
فریب اہل دنیا سے نہیں مرد خدا ڈرتے
حقیقت حیلۂ روباہ کی کیا چشم ضیغم میں
مجھے اس عالم افتادگی میں رشک آتا ہے
کہاں سے آگئی یہ طاقت پرواز شبنم میں
عجب ہے بزم مے میں سیر کرنا سارے عالم کی
کوئی قطرہ شراب عشق کا تھا ساغر جم میں

بقیہ کا سلسلہ ذرا سو توقف ہو تو دنیا تاریک ہو جائیگی کل یوم ہو فی شان ۱۲

ملی شاہ و گدا کی خاک تو ہوتی تھیں یہ باتیں
ملاپ آخر ہوا اک عمر کے بعد آپ میں ہم میں

۱۲۷ وامیل مفاعیل مفاعیل معایل ۲۰

گمراہ کیا نفس نے دنیائے دنی میں
رہزن کا مرا ساتھ ہی ابن وطنی میں

تنہا نہ ملا گوشہ مرقد بھی کسی کو
سنتے ہیں کہ کشتی ہوئی درویش غنی میں

مقتل میں مجھے یوں جگر و دل نظر آئے
یہ تیر[1] کے پیکاں میں وہ برچھی کی انی میں

سینہ میں ٹھہرتا نہیں دم تا بہ دم مرگ
کیسا یہ پس و پیش ہے امر شدنی میں

آئے تو کسی طرح سے اس بت کو تبسم
بجلی کی چمک دیکھ لو ہیرے کی کنی میں

جس نخل کو یہ سیل فنا دیتی ہے پانی
مصروف اوسی نخل کی ہے بیخ کنی میں

لازم ہے کہ دامان و گریباں میں ہو چاک
ہے موسم گل لطف ہے گل پیرہنی میں

کچھ پیر مغاں سے تجھے نسبت نہیں زاہد
ہوتا ہے بڑا فرق کریم اور دنی میں

رنگت تری لب کی ہے نزاکت نہیں لیکن
یاقوت بدخشاں نہ عقیق یمنی میں

بجلی سی چمک جاتی ہے پھرتا ہے جو توسن
شاید دل بیتاب ہے برچھی کی انی میں

اک بات کی جس سے ہوا کشتہ حسرت
کیا زہر گھلا ہے تری شیریں سخنی میں

قبلہ سے جو نور کی اٹھتی ہیں گھٹائیں
ڈوبا ہے چمن رنگ عقیق یمنی میں

کہنے میں نہ ہو نفس تو کر قتل کی تدبیر
کیا فرق ہے گردن کشی و گردن زدنی میں

[1] تیر اور برچھی مژہ اور نگاہ کے معنی میں ہے ۔ ۱۲

ہی نفس کی اصلاح تو بس نفس کشی میں
ہرگز سخن تلخ میں دیکھی نہیں یہ بات
ساتھ آئی ہی کچھ گرد کدورت جو وطن سے
چلتے ہیں وہ اب راہ سہارے پہ قلم کے
مل جائیگا محشر میں دل اس مردہ جو دو
کافر ہوں کسی بات کا مجھکو جو یقیں ہو
کرتے ہیں وہ ظلم اور پشیماں نہیں ہوتے

١٢٨

اندیشہ ہی رہزن کا بھی ہر راہ گذر میں
آنکھیں مری یوں محو تماشا ہیں تو
کہتے ہیں غلط تیر لگایا نہیں تو نے
افسانہ رہا محفل عشرت کا ہمیشہ
پرخوف یہ منزل ہی سبکسار گذر جا
ہیں شہر خموشاں میں کسی جا کے پکارو
دیتا ہی وہ نعمت تو اٹھائی نہیں اٹھتی
گر اہل جہاں داغ اٹھائی نہیں جلتے
بچپن سی جوانی ہی جوانی سی بڑھاپا

کچھ دل کی درستی ہو تو بس دل شکنی میں
کچھ کام نکلتا ہی تو شیریں سخنی میں
پروا مجھے مرقد کی نہیں بیوطنی میں
جو شہرہ آفاق تھے شمشیر زنی میں
عادت یہ ہمیشہ کی ہی اس ناشمنی میں
ملتا ہی مزہ آپ کو پیماں شکنی میں
سمجھے ہیں کہ آواز نہیں دل شکنی میں

٢١

اس طرح سے غافل کوئی سوتا ہی سفر میں
وہ داغ تھے گویا پر طاؤس نظر میں
تیر دل میں نے چھپایا ترے ناوک کو جگر میں
وہ شمع کا جلوہ نہ رہا رات ہی بھر میں
برسوں سے یہ آتی ہی صدا راہ گذر میں
در ہی مگر آواز نہیں حلقہ در میں
پھولوں سی لچک آ گئی شاخ گل تر میں
پھر کس لئے پیدا ہوئی اس دور قمر میں
ہی خاتمہ عمر اسی شام و سحر میں

کیوں نہ ئیے یار آنکھوں سے اپنی [illegible] لگا — باندھ کے جبریل کے پر میں
مست مئے عرفاں کو کسی طرح سنبھالے — ایسا بھی ہے ہشیار کوئی اہلِ خبر میں
اس راہ میں دم نکلے تو کیا دور ہے کیا کام — گر دنیا مجھے دفن اسی گردِ سفر میں
گر یوں ہی جفا دل کے گلے میں اتر آئے — نغمے تھے نہاں پردۂ برگِ گلِ تر میں
یہ شیشہ گری ابر نے کی ہے کہ ہوا نے — خلخالِ بلوریں ہے ہر اک ساقِ شجر میں
منظور اگر ہو دلِ مردہ کو جلانا — ہے تجھ میں عیسیٰ نفسِ بادِ سحر میں
حسرت ہے کبھی عمرِ گذشتہ کو کریں یاد — مہلت ہمیں اتنی نہ ملی آٹھ پہر میں
گھیرے ہوئے ہے خلق کو یوں نعمتِ خالق — جس طرح سے ہے جوئے کا سہ لعلہ سنگِ گہر میں
نکلا نہ کسی سوزنِ مژگاں سے مرا کام — بر سول ہی [illegible] تی رہی اک پھانس جگر میں
کہتی ہے یہ دانتوں کی چمک وقتِ تبسم — ڈورے کی جگہ برق ہے اس عقدِ گہر میں
ہے اس کی ادا قاتلِ عالم دمِ رفتار — تلوار لگا دی ہے نزاکت نے کمر میں

اس بزم میں ہے نظم جنہیں لطف نہ آئے
حافظ کی غزل میں نہ رباعی عمر میں

مفتعلن مفاعلن (۲) بار

سنگ جفا کا غم نہیں — دست طلب کا ڈر نہیں
اپنا ہے اس پہ آشیاں — نخل جو بارور نہیں

سنتے ہو اہلِ قافلہ   میں کوئی راہبر نہیں
دیکھ رہا ہوں تم میں سے ایک بھی راہ پر نہیں

موت کا گھر ہے آسماں   اس سے کہیں مفر
نکلیں تو کوئی در نہیں بھاگیں تو رہگذر نہیں

پہلے جگر پہ آہ کا   نام نہ تھا نشان نہ تھا
آخر کار یہ ہوا   آہ تو ہے جگر نہیں

صبحِ ازل سے تا ابد   قصہ نہ ہوگا یہ تمام
جورِ فلک کی داستاں   ایسی بھی مختصر نہیں

برگِ خزاں رسیدہ ہوں   چھیڑ نہ مجھکو اے نسیم
ذوقِ فغاں کا ہے مجھے   شکوۂ ابرِ تر نہیں

منکرِ حشر ہے کدھر   دیکھے تو آنکھ کھول کر
حشر کی جو خبر نہ دے   ایسی کوئی نہیں

شبنم و گل کو دیکھکر   وجد نہ آئے کس طرح
خندۂ بے سبب نہیں   گریۂ بے اثر نہیں

تیرے فقیر کا غرور   تاجوروں سے ہے سوا
طرفِ کلہ میں وہ شکن   اس کو یہ دردِ سر نہیں

کوشک و قصر و بام و در   تو نے بنا کئے تو کیا

حیف ہے خانماں خراب   دل میں کسی کے گھر نہیں

نالہ کشی رقیب سے   میری طرح محال ہے
دل نہیں حوصلہ نہیں   زہرہ نہیں جگر نہیں

شاطر پیر آسماں   واہ ری تیری دستبرد
خسرو و کیقباد کی   تیغ نہیں کمر نہیں

شان کریم کی یہ ہے   اس سے ہو بیشتر عطا
لطف عطا کا کیا ہو جب   ہاں سے ہو بیشتر نہیں

لاکھ وہ بیرخی کرے   لاکھ وہ کج روی کرے
کچھ تو ملال اس کا ہو   دل کو مرے مگر نہیں

سن کے برا نہ مانئے   سچ کو نہ جھوٹ جانئے
ذکر ہے کچھ گلہ نہیں   بات ہے نیشتر نہیں

حرف واو

۱۲ مفاعیلن چار بار

ندامت ہے بنا کر اس چمن میں آشیاں مجھ کو
ملا ہمدم یہاں کوئی نہ کوئی ہمزباں مجھ کو
دکھائے جاں روانی تو سراسر عمر رواں مجھ کو

ہلال برق سر رکھ ہم رکاب ہم عناں مجھ کو

بنایا ناتوانی نے سلیمان زماں مجھ کو

اڑا کر لے چلے موج نسیم بوستاں مجھ کو

[illegible] وم صبح ازل سے میں نوا سنجوں میں ہوں شیریں

[illegible] بلبل سدرہ نے انداز فغاں مجھ سے

[illegible] کیا معلوم کب سوئے وہ کب جاگے

[illegible] تو اس لئے کھینی پڑی پھر داستاں مجھ کو

[illegible] بیم زار کو پھینکا

[illegible] میں حق بانگ درائے کارواں مجھ کو

[illegible] ہو کر بھی نہ جائے گی

[illegible] لب ساحل سے یہ ریگ رواں مجھ کو

[illegible] ترا تیرے واسطے میں نے

[illegible] اندہ ملال منزلوں میں آسماں مجھ کو

[illegible] جلا دے ہوں وہ پروانہ

[illegible] آگ دل میں جب نظر آیا دھواں مجھ کو

[illegible] آیا ناتواں ہو کر

[illegible] سے حسرت دیدار لے آئی کہاں مجھ کو

وہ جس عالم میں جا پہونچا وہاں میں کسطرح جاؤں
ہوا دل آپ سے باہر پہنا کر بیڑیاں مجھ کو
غبار راہ سے لے تنظیم پیدا آواز آتی ہے
گئی اے عمر رفتہ تو کدھر پھینکا کہاں مجھکو

١٢
نہیں پیدا جو ظالم نے مٹایا میری تربت کو
لحد بن جائے گر ظاہر کروں دل کی کدورت کو
کسی نے شعلہ ساں آنچل میں باندھا ہو شرارت کو
گرہ میں باندھیے اب شل اخگر داغ حسرت کو
ترے ممنون ہم سب رند اے باد بہاری ہیں
اوڑا لاتی ہے میخانہ پہ تو باران رحمت کو
یہ وہ دن ہیں کہ اب آنکھوں کو اپنی ڈھونڈتے ہیں ہم
گئے وہ دن کہ آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں اسکی صورت کو
نکل جاتا ہے نام اک شعر اگر اچھا نکل آئے
یہ دو مصرع تو گویا پر لگا دیتے ہیں شہرت کو
ہوا سالک کو حاصل کیا دو صد زانو تامل سے
کہ دیکھا گام اول میں دو صد آئینہ حیرت کو

نگاہ آشنا کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
پس پشت اپنے گویا ڈھونڈھتے ہیں مروت کو

حسینوں کو کیا گردیدہ اس نے آئینہ بن کر
دل وارفتہ نے جس طاق پر رکھا تھا حیرت کو

کہیں الزام محشر میں نہ ہو اس پر تغافل کا
میرے لاشہ پہ لے آئے کوئی اس بے مروت کو

پلک جھپکاتے نرگس کو نہ دیکھا باغ میں ہم نے
جو آنکھیں ہوں تو بس دیکھا کرے صانع کی قدرت کو

بیاباں ہو ابھی زنداں میں پیدا سے ہو اندیشہ
جھٹک دوں میں اگر دامن سے گرد کلفت کو

نہ تھی لے نظم تا بیرا او کچھ دل کے بہلنے کا
گریباں سے تو الجھا تا

۱۳۲ عجب شوریست از حرف دل دیوانہ در پہلو
شب ما زندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو

خوشم آید ز ساغر خندہ سرشار بر رویم
خوشم آید ز مینا گریہ مستانہ در پہلو

وفور مستی من کرد برہم وضع محفل را
در آغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو
نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشۂ ہستی
نگاہم محو غیر و جلوۂ جانانہ در پہلو
شہا عرفاں اگر از ما سوا پہلو تہی کردی
بہ بیں گر گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو
زدم بر شمع بالیں آستینے در شب ہجراں
دلم می سوخت بر بیتابی پروانہ در پہلو
بشمع قامت آں ترک حسن فتنہ زا باشد
کہ خود تیغش بلرزد چوں پر پروانہ در پہلو
تنم را زار کرد است آنچناں سودائے زلف او
نمایاں استخوانہا گشتہ مثل شانہ در پہلو
بشر در انقلاب دہر گوئی در غلطان است
بہر پہلو کہ غلطد دارد آب و دانہ در پہلو
ہمانا چارۂ داغ دل از مرہم نمی آید
کہ دارم پنبہ بر پہلو و آتش خانہ در پہلو
دلم محو طلسمات جہاں من طالب صانع

ہوائے کعبہ در سر دارم و بت خانہ در پہلو
خوشا وقت قدح خواری کہ گردش می کند باہم
شمارش ساغر و ہم سبحہ صد دانہ در پہلو
چہ طور راز [illegible] تنہا کہ بنوشتم باد آخر
کہ ہر یک نقطہ دارد معنی بیگانہ در پہلو
چو گل با خار بینی جائے فریاد است اے حیدر
کہ دل سوزد بہ آتش پر خندہ و بیگانہ در پہلو

عبث ہے ناز استغنا پہ کل کی کیا خبر کیا ہو ۱۳۴
خدا معلوم یہ ساماں کیا ہو جائے [illegible]
یہ آہ بے اثر کیا [illegible] نخل بے ثمر کیا ہو
[illegible] یارب تو دل کیا ہو جگر کیا ہو
جہاں انسان کھو جائے [illegible] محفل میں
رسائی اس سا [illegible] ہو وہاں کیونکر ہو گذر کیا ہو
نہ پوچھو لگا [illegible] بھی جام [illegible] زہر یا امرت
تمہارے ہاتھ سے اندیشۂ نفع و ضرر کیا ہو
مروت سے ہو بیگانہ وفا سے دور ہو کوسوں

یہ سچ ہے نازنین ہو خوبصورت ہو مگر کیا ہو

شگوفے دیکھ کر مٹھی میں زر کو مسکراتے ہیں
کہ جب عمر اس قدر کوتاہ رکھتے ہیں تو زر کیا ہو

رہا کرتی ہے یہ حیرت مجھے زہد ریائی پر
خدا سے جو نہیں ڈرتا اوسے بندہ کا ڈر کیا ہو

کہا میں نے کہ نظم مبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اوس نے اگر مر جائے تو میرا ضرر کیا ہو

کہا میں نے کہ ہے سوز جگر اور اف نہیں کرتا
کہا اس کی اجازت ہی نہیں پھر نوحہ گر کیا ہو

کہا میں نے کہ دے اوس کو اجازت آہ کرنے کی
کہا اوس نے بھڑک اٹھے اگر سوز جگر کیا ہو

کہا میں نے کہ آنسو آنکھ کا لیکن نہیں تھمتا
کہا آنکھیں کوئی تلووں سے مل ڈالے اگر کیا ہو

کہا میں نے قدم بھر پر ہے وہ صورت دکھا آؤ
کیا منھ پھیر کر اتنا کسی کو درد سر کیا ہو

کہا میں نے اثر مطلق نہیں کیا سنگدل ہے تو
کہا جب دل ہو پتھر کا تو پتھر پر اثر کیا ہو

کہا میں نے جو مر جائے تو کیا ہو سوچ لو دل میں
کہا نا عاقبت اندیش نے کچھ سوچ کر کیا ہو
کہا میں نے خبر بھی ہے کہ دی جان اوس نے گھٹ گھٹ کر
کہا مر جائے جس کی سو تو پھر مجھ کو خبر کیا ہو

---

١٤ مجھی کو کہہ رہے ہو سب کہ سرگرم فغاں کیوں ہو ١٢٢
کوئی اس سے نہیں کہتا کہ تم نامہرباں کیوں ہو
نہ کھینچ اے چارہ گر پیکان قاتل میرے سینے سے
ملیں یوں دل سے دل باہم تو کوئی درمیاں کیوں ہو
سرائے دہر میں ٹھہرے تو پھر شکوہ شکایت کیا
جسے خون جگر کھانا ہو وہ مہماں کیوں ہو
یکایک پھیر لینا آنکھ کا بس قہر ڈھاتا ہے
اگر کہہ سن کے بگڑو بھی تو مرگ ناگہاں کیوں ہو
ملے گی داد کیا محشر میں ہم کو اس ستمگر سے
نہیں ہونا ہوا کچھ تو پھر شور و فغاں کیوں ہو
قیامت آج ہی آ جائے صور حشر پھنک جائے
شب غم میں سحر کیوں صبح کی نوبت اذاں کیوں ہو

جب اپنی خو یہ ٹھہرے منہ میں جو آئے سو کہہ جانا
تو پھر کہنا کسی کا طبع نازک پر گراں کیوں ہو

اشارہ میں گلِ نرگس نے پوچھا اسکی آنکھوں سے
فدا میں تم پہ تم بیمار کیوں ہو ناتواں کیوں ہو

نہ دیوانوں کے منہ لگ تو نہ ایسی گت بنی ناصح
اڑیں دامن کے کیوں پرزے گریباں دھجیاں کیوں ہو

وہ میرا جستجو میں اس کی جانا رم خوباں میں
اور اس کا بدگمانی سے یہ کہنا تم یہاں کیوں ہو

اسے بے مانگے ہی دینے کی عادت تو نے ڈالی ہے
تو شرمندہ کسی کا پھر گدائے آستاں کیوں ہو

سمجھ لے دہر کو جاتا ہوا سیلاب ہے ورنہ
حباب آسماں کے ساتھ موج کہکشاں کیوں ہو

خبر لو ایک رنگ آتا ہے اک جاتا ہے چہرہ کا
تلون گر نہ ہو تو تیوریوں میں ہو پیچاں کیوں ہو

تڑپنا نیم بسمل ہو کے حیدرؔ تھا مقدر میں
رکے میں جب وہی مجھ سے تو پھر خنجر رواں کیوں ہو

سے ملے ہیں نقش جو ہم بوریا نشینوں کو
وہ دست یاب نہیں شاہوں کے نگینوں کو

کیا ہے صاف دلوں کی جو دوربینوں کو
تو ساتھ پردوں میں دیکھا کئے حسینوں کو

ہزار طرح سے پہلو تہی وہ کرتا ہے
کہیں جگہ نہیں ملتی ہے ہم نشینوں کو

گلہ بھی اس کے تغافل کا ہو نہیں سکتا
غرور و ناز ہی زیبا ہے نازنینوں کو

چمن کی سیر مبارک ہو تجھ کو اے نرگس
کسے یہ تاب کہ دیکھا کرے حسینوں کو

جہاں جہاں مری فکر بلند کا ہے عمل
نہ آسمان سے بدلوں میں ان زمینوں کو

ہوس رہی نہیں دولت کی خاکساری کیا
کہ اس زمین نے سرکا دیا دفینوں کو

بتا دیا ہے ہمیں ساقی ازل نے یہی
کہ اپنے رنگ میں تو کھینچ ہم نشینوں کو

نہ پوچھ بادِ صبا موسم خزاں کا ملال

بسر کیا ہے بری طرح ان مہینوں کو
چھپائیں چاند کو کیا خاک ڈال کر اے نظم
بھلا میں دل کی کدورت سے مہ جبینوں کو

۱۸ ۱۳۶

کیا شراب نے رنگین آبگینوں کو
تو زنگ دیا ترے ساعد نے آستینوں کو
ہوس مقابلہ کی اوس سے تھی حسینوں کی
صفیں الٹ گئیں الٹا جو آستینوں کو
خدا کرے نہ کسی کو کسی کا دست نگر
کہ بار بار چڑھاتے ہیں آستینوں کو
قبائے یار سے کس طرح دیتے ہم تشبیہ
قبائے گل میں نہ دیکھا تھا آستینوں کو
جہاں سے اہل ہوس ہاتھ اٹھا نہیں سکتے
ہزار بار چڑھایا ہے آستینوں کو
کوئی غبار کے پردے میں ہو نہ دامن گیر
الٹ لے آئینہ پرداز آستینوں کو
نشاں بن گئے ہیں ناز کی سے ہاتھوں پر

قبا جو پہنی ہے چنوا کے آستینوں کو

غرض کسی نہ کسی طرح چھنگیاں لینا
کوئی یہ جانے کہ چنتے ہیں آستینوں کو

بہار دیدۂ خونبار کا ہوں میں مفتوں
کہ شاخ گل سے ہے تشبیہ آستینوں کو

نہ رکھا تار گریباں میں نہ دامن میں
الٹ کے بخیۂ وحشت نے آستینوں کو

رہا جنوں میں بھی مجھ کو لحاظ پردہ دری
دیا ہے چاک گریباں کا آستینوں کو

ہے اوج فقر یہ زاہد جہاں سے کھینچ کے ہاتھ
بنا لیا پر پروانہ آستینوں کو

جو بزم میں ہو تماشائے رقص او سے منظور
نکالے جامۂ فانوس آستینوں کو

کنارہ جو نظر آتا ہے بخیۂ مرجاں
چنا ہے مل کے حنا اس نے آستینوں کو

تغیر یہی ہے سبب کسر شان ہے چین جبیں
شکن ہے جیسے ہو کوتاہی آستینوں کو

بنایا اشکوں نے دامن کو دامن دریا
بجا ہے موج سے تشبیہ آستینوں کو

کمال حسن ہے دست ہوس کی کوتاہی
شکن نہ زیب دے کس طرح آستینوں کو

ہر ایک شعر میں چیدہ ہیں مصرع اے حیدر
چنا ہے شاہد مضموں کی آستینوں کو

۱۴۷ ——— فاعیل فاعلات مفاعیل فاعلات ——— ۱۵

۱۴۷

اتنا تو میں ضرور کہوں گا خفا نہ ہو
آئینہ کہہ رہا ہے کہ ہو محو ناز تو

ہستی فقط تصور ہستی کا نام ہے
وہ آدمی نہیں ہے جو خالی ہو درد سے

منکر ہر ایک شئے سے اسی کا ظہور ہے
وہ بھی ہیں لوگ حشر میں جنکو ہے شوق دید

اغیار تو ہوں ساقی مہوش شریک دور
بھولا ہوا ہے حیف تعہد الست کو

ہے زیست وہ پہاڑ جو کاٹے نہ کٹ سکے
دریائے بے کنار ہوا اور اک میں ناآشنا

۱۵

بے مثل حسن میں ہو اگر بے وفا نہ ہو
سمجھا رہی ہے شرم کوئی دیکھتا نہ ہو

زندہ نہیں ہے وہ جسے ذوق فنا نہ ہو
اس دل کو دل نہ جانئے جو مبتلا نہ ہو

اس کا علاج کیا جو تجھے سوجھتا نہ ہو
ڈرتا ہوں میں خدا کہیں سامنا نہ ہو

پھیروں کھڑے رہیں تو ہماری صلا نہ ہو
ممکن ہے یہ کہ مرکے بھی وعدہ وفا نہ ہو

اس راہ میں اگر فرس بادپا نہ ہو
خنجر دیدہ احباب کوئی آشنا نہ ہو

اس دشت سے گزر تو سبکبار ہی گزر — اس طرح جاہیے کہ کہیں نقش پا نہ ہو
پھیلاؤ آشنا پاؤں نہ دنیا کو دیکھ کر — گھر جس کو اپنا سمجھے ہو مہماں سرا نہو
کیا ہونگے اوسے پھول کہ وہ گلبانگ ہیں — کیا چاندنی کا لطف جو وہ مہ لقا نہو
مشکل پسند میری طبیعت ہے شیوہ ہا — جاتا ہوں اس طرف کہ جدھر راستا نہو

حیراں ہوں میں عاہی کہ یہ کو سنا ہے نظم
کہتے ہیں مجھ کو دیکھ کے تیرا برا ہو

١٣ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ٢٢٨

مجھ کو سمجھو یادگار رفتگان لکھنؤ
ہوں قیامت آدم غبار کاروان لکھنؤ

خون حسرت کہہ رہا ہے داستان لکھنؤ
رہ گیا ہے اب یہی رنگیں بیان لکھنؤ

گوش عبرت سے سنے کوئی مری فریاد ہے
بلبل خونیں نوائے بوستاں لکھنؤ

میرے ہر آنسو میں اک آئینہ تصویر ہے
میرے ہر نالہ میں ہے طرز فغان لکھنؤ

ڈھونڈھتا ہے اب کسے لے کر چراغ آفتاب
کیوں مٹایا اے فلک تو نے نشان لکھنؤ

لکھنؤ جن سے عبارت تھی ہوئے وہ ناپدید
ہے نشانِ لکھنؤ باقی نہ شانِ لکھنؤ

اب نظر آتا نہیں وہ مجمع اہلِ کمال
کھا گئے ان کو زمین و آسمانِ لکھنؤ

پہلے تھا اہلِ زبان کا دور اب گردش میں ہیں
چاہیئے تھی تیغ اردو کو فسانِ لکھنؤ

مرثیہ گو کتنے یکتائے زمانہ تھے یہاں
کوئی تو تاتوں میں ہوتا نوحہ خوانِ لکھنؤ

یہ غبارِ ناتواں خاکسترِ پروانہ ہے
خاندان اپنا تھا شمع دودمانِ لکھنؤ

چلتا تھا جب گھٹنیوں اپنے یہاں طفلِ رضیع
سجدہ کرتے تھے اُسے گردن کشانِ لکھنؤ

عہدِ پیرانہ سری میں کیوں نہ شیریں ہو سخن
بچپنے میں ہم نے چوسی ہے زبانِ لکھنؤ

گلشنِ فردوس پر کیا ناز ہے رضواں تجھے
پوچھ اس کے دل سے جو ہے رتبہ دانِ لکھنؤ

بوئے اُنس آتی ہے حیدر خاکِ مٹیا برج سے

مجمع میں اک جا وطن آوارگانِ لکھنؤ

۱۶ ۱۳۹

فغاں از آہ و زاری دلِ دیوانہ در پہلو
شب ما زندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو
دلِ من سوخت ناگاہ پرتوے از شمعِ رخسارش
فغاں کیں شعلہ افتادہ است بیباکانہ در پہلو
خوشم آید ز ساغر خندۂ سرشار بر رویم
خوشم آید ز مینا گریۂ مستانہ در پہلو
و فورِ مستی من کرد برہم وضعِ محفل را
درآغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو
نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشۂ ہستی
نگاہم محوِ غیر و جلوۂ جانانہ در پہلو
خوشا عرفاں اگر از ما سوا پہلو تہی کردی
بہ بیں کز گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو
زدم بے شمع بالیں آستینے در شبِ ہجراں
دلم می سوخت بر بے تابیِ پروانہ در پہلو
بشمعِ قامت آں ترکِ حسن فتنہ زا باشد

که خود تیغش بلرزد چون پر پروانه در پهلو

تنم را زار کرد ست آنچنان سودای زلف او
نمایان استخوان ها گشته مثل شانه در پهلو

بشر در انقلاب دهر گوئی در غلطان است
بهر پهلو که غلطد دارد آب و دانه در پهلو

همانا چاره داغ دل از مرهم نمی آید
که دارم پنبه بر پهلو و آتش خانه در پهلو

مثل شد در تناسب چشم و ابرویش چو در عالم
ز راه شوق مسجد می کشد بتخانه در پهلو

دلم محو طلسمات جهان من طالب صانع
هوای کعبه در سر دارم و بتخانه در پهلو

خوشا وقت قدح خواری که گردش میکند باهم
ببزمش ساغر و هم سبحه صد دانه در پهلو

چه طومار شکایتها که بنوشتم باو آخر
که هر یک لفظ دارد معنی بیگانه در پهلو

چو گل با خار بینی جای فریاد است ای حیدر
که دل سوزد لبش پرخنده و بیگانه در پهلو

۱۲۹

حرف ہ

۱۲

کس لئے چھپتے ہیں یہ شمس و قمر دونوں ساتھ
کس کو یہ ڈھونڈتے ہیں برہنہ سر دونوں ساتھ

کیسی یارب یہ ہوا صبح شب وصل چلی
بجھ گیا دل مرا اور شمع سحر دونوں ساتھ

بعد میرے نہ رہا عشق کی منزل کا نشاں
مٹ گئے راہرو و راہ گذر دونوں ساتھ

اے جنوں دیکھ اوسی صحرا میں اکیلا ہوں میں
رہتی جس دشت میں ہیں خوف و خطر دونوں ساتھ

مجھ کو حیرت ہے شب عیش کی کوتاہی پر
یا خدا آئے تھی کیا شام و سحر دونوں ساتھ

اس نے پھیری نگہ ناز یہ معلوم ہوا
کھینچ گیا سینے سے تیر اور جگر دونوں ساتھ

غم کو دی دل نے جگہ دل کو جگہ پہلو نے
ایک گوشے میں کریں گے یہ بسر دونوں ساتھ

اس کو روکوں میں الٰہی کہ سنبھالوں اس کو
کہ تڑپنے لگے دل اور جگر دونوں ساتھ

ناز بڑھتا گیا بڑھتے گئے جوں جوں گیسو
بل کی لینے لگے اب زلف و کمر دونوں ساتھ

تجھ سے مطلب ہے نہیں دنیا[1] و عقبیٰ سے غرض
تو نہیں جب تو اجڑ جائیں یہ گھر دونوں ساتھ

بات سننا نہ کسی چاہنے والے کی کبھی
کان میں پھونک رہے ہیں یہ گہر دونوں ساتھ

نہ رہا آہ کی بھی اشک کا سیلاب بھی ہے
دیتے ہیں دل کی خرابی کی خبر دونوں ساتھ

کیا کہوں زہرہ و خورشید کا عالم اے نظم
نکلے خلوت سے جو نہیں وقت سحر دونوں ساتھ

[1] دنیا میں الف مقصور ہے بعد الف اس کا متحرک کر لینا جائز ہے

۱۴۱ ——— ۱۱

یوں تو نہ ترے جسم میں ہیں زینہار ہاتھ
دینے کے اے کریم مگر ہیں ہزار ہاتھ

انگڑائیوں میں پھیلتے ہیں بار بار ہاتھ
شیشہ کی سمت بڑھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

ڈوبے ہیں ترکِ سعی سے افسوس تو یہ ہے
ساحل تھا ہاتھ بھر پہ لگاتے جو چار ہاتھ

آتی ہے جب نسیم تو کہتی ہے موجِ بحر
یوں آبرو سمیٹ اگر ہوں ہزار ہاتھ

دیتے ہیں میرے قتل کے احباب اور بیں
خوش ہوں کہ میرے خون میں رنگتے ہیں یار ہاتھ

دامن کشاں چلی ہے بدن سے نکل کے روح
کھنچتے ہیں پھیلتے ہیں جو یوں بار بار ہاتھ

مٹتا نہیں نوشتۂ قسمت کسی طرح
پتھر سے سر کو پھوڑ کے زانو پہ مار ہاتھ

ساقی سنبھال کہ ہے لبریز جامِ مے
لغزش ہے میرے پاؤں میں اور رعشہ دار ہاتھ

مطرب سے پوچھ مسئلہ جبر و اختیار
کیا تال سم پہ اٹھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

میں اک ہوں علائقِ دنیا کے دام میں
میرا نہ ایک ہاتھ نہ ان کے ہزار ہاتھ

اے نظمؔ وصل میں بھی رہا تو نہ چین سے
دل کو ہوا قرار تو ہے بے قرار ہاتھ

حرف ی

فاعیل فاعلات م فاعیل فاعلات

۱۴۲ ——— ۲۰

جھگڑا پڑا ہوا ہے نکلنے میں جان کے
کچھ حوصلے ابھی ہیں اُسی امتحان کے

آئی بہار اور خفقانی جہاں کے
جنگل میں پیرہن کے گئے خاک چھان کے

لایعقلانہ طرز ہیں سارے جہان کے
کیسی شراب دور میں ہے آسمان کے

کیا دیر انقلاب میں اب نئے جہان کے
تا یہ پہنچ گئے ہیں قریب آسمان کے

دکھلا دو منہ ذرا صفِ محشر میں آن کے
اوڑ جائیں ہوش آج بھی سارے جہان کے

چاہے تو دو جہاں کو ڈبو دے یہ طفلِ اشک
مستغنی ہیں یہ سات ورق آسمان کے

حیران ہوں گلہ جو کسی سے کروں تو کیا
جو دل کا حال ہے نہیں قابل بیان کے

پازیب تک پہنچ گئے تو حلقہائے زلف
قلابے مل گئے ہیں زمیں آسمان کے

ہے مغتنم کہ ہجر میں رونا ہی آ گیا
آنکھوں پہ لوں گا میں قدم اس میہمان کے

سمجھا چھوڑ اچکا تھا میں دل اٹھا کے ہاتھ
دل ہاتھ دھو کے بیٹھ رہا میری جان کے

کوندا یہ کہہ رہا ہے کہ ہے فوجِ گل قریب
کہسار تک پہنچ گئے ہاتھی نشان کے

شیریں ہیں تیری گالیاں بھی حرفِ تلخ
اوصاف کس زبان سے ہوں اس زبان کے

پاتا تجھے نہ عالمِ اجسام میں کہیں
چھان آئی فکر سات طبق آسمان کے

اب تک میں سن رہا ہوں صدائے الست کو
گویا حجابِ قدس یہ پردے ہیں کان کے

احسان سر پہ لے تو کسی بادِ وقار کا
ٹھہرے اگر تو سایہ میں اونچے مکان کے

آنکھوں کے سامنے سے گیا ہے وہ قافلہ
دیکھے حباب میں لوگ اس آن بان کے

بہتر ہی تو ہمیں اے نفسِ واپسیں نہ آ
کب تک اوٹھاؤں ضعف میں صدمے تکان کے

سوتی میں چشمِ غول کو سمجھا چراغِ بام
مارا پڑا میں دہیاں میں تیرے مکان کے

اے دود آہ ہو گئی رسوائیوں کی حد
جھنڈی پہ چڑھ گئی ہیں تری ہاتھی نشان کے

اے ناظم بزم عیش یہ مقتل کا ہے گماں
چھریاں یہ چل رہی ہیں کہ فقرے اذان کے

۱۴۳ ——— ۲۱

روکے ہوئے ہے بن کے حصار آسماں مجھے
ذوق وصال کھینچ کے لایا کہاں مجھے

لے تو چلا ہے توسن عمر رواں مجھے
اس کی خبر نہیں کہ گرا دے کہاں مجھے

ہوش و خرد ملے مجھے تاب و تواں مجھے
اس کے عوض اٹھانا ہے بار گراں مجھے

ہوں قلزم فنا میں سہارے یہ سانس کے
دیکھ اے حباب خوب ملا بادباں مجھے

جب سے کنارہ میں نے کیا سرو کی طرح
یکساں ہے اس چمن کی بہار و خزاں مجھے

کچھ کہہ رہی تھی شہر خموشاں کی خامشی
کوئی سنے تو یاد ہے اک داستاں مجھے

جلدی نہ کر تعلق دنیا ہے سد راہ
اے موت توڑنا ہے یہ بند گراں مجھے

اچھا اگر نہیں شنوائی نہیں سہی
اس کا علاج کیا کہ ہے ذوق فغاں مجھے

کہتا ہے اٹھتے بیٹھتے واماندوں کا غبار
کیوں ٹھوکروں میں لے نہ گیا کارواں مجھے

خود کو سنبھالتا کہ میں دل کو سنبھالتا
اک بیخودی تھی ہوش تھا یارب کہاں مجھے

دیکھا شعار اہل ورع سمعہ و ریا
آئی پسند صحبت دیر مغاں مجھے

سن لے یہ کہہ رہا ہے زمانہ شباب کا
وقت عزیز میں ہوں نہ کر رائگاں مجھے

بھولا ہوا ہوں عہد کو صبح الست کے
پہلا سبق ہوا نہیں اب تک رواں مجھے

ناوک لگا رہا ہے اس انداز سے کوئی
لہرا رہی ہے موجِ ترنگ کماں مجھے

سر میں سفیدی آگئی پایا نہ پھر بھی ہوش
پچھلے کی چاندنی ہے یہ خوابِ گراں مجھے

کچھ کم نہ تھا بہار کا غم اس پہ یہ ستم
رہ رہ کے چھیڑ جاتی ہے بادِ خزاں مجھے

آفاتِ دہر سے تھا ہراساں میں کس قدر
دی مرگِ ناگہاں نے نویدِ اماں مجھے

زحمت بغیر خلق میں راحت نہیں نصیب
تنکے چنے ہیں جب تو ملا آشیاں مجھے

خواہش کی پیروی سے ہے جہنم کا سامنا
گلخن نہ میں سمجھ لی ہوس گلستاں مجھے

باہم جو اتحاد ہے پایا نہیں رقیب
اس کے وہاں آوے تو میری بیاں مجھے

اے نظم کوہ و دشت میں پکار رہا ہوں اب
بانگِ جرس ہوں چھوڑ چلا کارواں مجھے

۱۴۳ ۲۲

گذری نسیم باغ کو شاداں کیے ہوئے
رہ جاتے ہیں جہان میں احساں کیے ہوئے

رخ ہے عدم کا عمر گریزاں کیے ہوئے
ہستی کو گرد جنبش داماں کیے ہوئے

تھی صبح ظلمتِ شبِ غم سے ڈری ہوئی
آئی چراغ کو تہِ داماں کیے ہوئے

کیا جلد جا رہا ہے زمانہ نشاط کا
اسپ عناں گسستہ کو جولاں کیے ہوئے

آیا تھا جوشِ لالہ و گل کی طرح شباب
جاتا ہے خونِ حسرت و ارماں کیے ہوئے

دشمن سے بھی رنج پہنچے تھے وہ سب بھلا دیے
بھولا نہیں ہوں دوست کے احساں کیے ہوئے

میدانِ بازپرس میں دیوانگانِ عشق
بیٹھے ہیں جا کے دفترِ عصیاں کیے ہوئے

وہ چار اشک نذر کو لایا ہوں اے کریم
جو خون آرزو میں ہیں غلطاں کیے ہوئے

شبنم اوڑھی ہے پھونک کے افسون ناز
تسخیر آفتاب کا ساماں کیے ہوئے

ہم آپ سے ملے تھے بزم الست میں
کچھ یاد بھی ہیں وعدہ و پیماں کیے ہوئے

آزادہ مشربی کا جنہیں کچھ نہیں خیال
یہ لوگ زندگی کو ہے زنداں کیے ہوئے

کیا کیوں پہ فخر ہے سفا کیوں پہ ناز کیا
منہ دیکھتے ہیں تیغ کو عریاں کیے ہوئے

قامت میں اس کے اور قیامت میں فرق کیا
مصرعے ہیں دو [illegible] کیے ہوئے

یاران رفتہ سوتے ہو کس کنج تار میں
بزم نشاط عیش کو ویراں کیے ہوئے

راہ طلب میں بیچ کے ہوا و ہوس چلیں
ہاں سرکشوں کو تابع فرماں کیے ہوئے

[illegible] نے [illegible] شکست کہ دیا جواب
جاتی ہے بیرتی صف مژگاں [illegible] کیے ہوئے

امید [illegible] طاؤس کا شکار
رنگ پریدہ کو چمنستاں کیے ہوئے

ساقی تو یہ مژدہ کہ آئی ہے فصل گل
بدلی میں آفتاب کو پنہاں کیے ہوئے

کلی چمن [illegible] مشکلیں ہیں سب
چٹکی کلی کہ عقدے ہیں آساں کیے ہوئے

کیا دامن نسیم میں ہے جانفزا ہوا
سمجھے نہیں چراغ فروزاں کیے ہوئے

شبنم [illegible] ہنسا [illegible]
بال پری کا رنگ نمایاں کیے ہوئے

کیا لالہ زار خون سر کوہکن کا ہے
دامن میں میتوں سے چراغاں کیے ہوئے

اے نظم شاعری نہ سہی ساحری تو ہے
[illegible] اس کا اعتراف سخنداں کیے ہوئے

اوتنا ہی شکر نعمت و راحت میں چاہیے — جتنا کہ صبر رنج و مصیبت میں چاہیے
جتنی شراب محفل عشرت میں چاہیے — اوتنا ہی خون دل غم فرقت میں چاہیے
اس بات کا خیال محبت میں چاہیے — یعنے جو چاہیے تو حقیقت میں چاہیے
برگ حنا و سنگ سے اس ہی پائے مال — بس ایک رنگ معنی و صورت میں چاہیے
میکش ہو رند مست ہو شاہد پرست ہو — ہاں سمعہ و ریا نہ عبادت میں چاہیے
نکلا حریم قدس رگ جاں کے متصل — ایسی طناب پردۂ قدرت میں چاہیے
پہلو سے دل نکال کے ہاتھوں پہ اپنے رکھ — ایسا حضور قلب عبادت میں چاہیے
خدمت کا عمر بھر کی صلا اے متاع دہر — کیا دو ہی گز کفن مجھے خلعت میں چاہیے
اے اضطراب لاش لحد کو تو یوں ہلا — کچھ فرق گاہوارہ و تربت میں چاہیے
ہستی کے ساتھ روگ میں لاکھوں لگے ہوئے — جو چاہیے نہیں وہ اس آفت میں چاہیے
حسرت سہی امید سہی آرزو سہی — مونس کوئی تو عالم وحشت میں چاہیے
اہل وطن نہیں نہ سہی یاد وطن سہی — کوئی تو ساتھ وادی غربت میں چاہیے
آنکھوں میں پڑ گئی ہے یہ خاک رہ نگار — سرمہ ضرور دیدۂ عبرت میں چاہیے
اپنی ہی جب نظر میں سماتے نہیں ہیں ہم — اب کون سی ہے بات جو ذلت میں چاہیے
احباب پر نہ لاش اٹھانے کا بار ہو — میری لحد بھی گوشۂ عزلت میں چاہیے
طعنے دئے تو گالیاں دینے میں شرم کیا — کچھ تو بھلا نمک بھی جراحت میں چاہیے

یوسف اگرچہ دل ہے مرے دو کافی نہیں | تکرار اور آپ سے قیمت میں چاہیئے

منزل جو ہے پہاڑ تو اے نظم غم نہ کر
تیزی قدم کی قطع مسافت میں چاہیئے

۱۴۵ — ۱۰

پہلو میں دل ہے آرزوئے یار کے لئے | آنکھیں ملی ہیں حسرت دیدار کے لئے
طاعت یہ تجھ کو ناز یہ رحمت پہ مجھکو ناز | زاہد یہ حسن بعض ہے بیکار کے لئے
سب ہو گئے تن کھڑے ہیں قیامت کے خوف سے | شاید نہال بال گنہ گار کے لئے
کانٹوں نے پیرہن کو تبرک بنا لیا | ایک ایک تار لے لیا دستار کے لئے
اب کے عجب نہیں نئے ہوئے بہار سے | او تریں مسیح نرگس بیمار کے لئے
دیکھا نگاہ بھر کے جو آنکھوں نے یار کو | دو جام بھر کے شربت دیدار کے لئے
لالچ سے ہے ال زر کا بری طرح کا گلہ | دیتے ہیں جان شربت دینار کے لئے
پہلو میں اندنوں ہے ستم و یاس کا ہجوم | دل کے لئے جگہ ہے نہ دلدار کے لئے
یاد آتی ہے ہوا تری کوچہ کی خلد میں | دل لوٹتا ہے سایہ دیوار کے لئے

حیدر کو سلسلہ تھا نہ ان گیسوؤں سے کچھ
لیکن الجھ پڑے ہیں وہ بیکار کے لئے

۱۴۶ — ۱۳

اعمال کے سبب سے گراں بار ہو گئے | جو مرحلے تھے سہل وہ دشوار ہو گئے

میکش کے حق میں زہر ہے تمیز نیک و بد
رحمت خدا کی ان کو جو ہشیار ہو گئے

بسمل دل و جگر کو نہ دیکھا تھا اس طرح
نالے تو آج کھنچتے ہی تلوار ہو گئے

قہر و عتاب کی بھی نگاہیں تھیں دلنشیں
پیوست تیر تا لب سوفار ہو گئے

اس رہ گذر میں دام نشان پر دام تھا
آزاد بھی ہوئے کہ گرفتار ہو گئے

بجلی کی طرح کرتے ہیں راہ صراط طے
اس پار پہ تڑپ کے ہم اوس پار ہو گئے

دانتوں کے ساتھ دیکھے ہیں تارے بھی ٹوٹتے
جو دن تھے زندگی کے شب تار ہو گئے

مومن پھڑکتے رہ گئے پھندے میں سبحہ کے
کافر اسیر حلقۂ زنار ہو گئے

عبرت سے دیکھ گور غریباں کے ڈھیر کو
کتنے ہی قصر تن تھے جو مسمار ہو گئے

ساقی کی چشم مست کا رندوں سے حال پوچھ
ملتے ہی آنکھ واقف اسرار ہو گئے

مرنے کی آرزو ہی شب غم میں رہ گئی
حیلے جو موت کے تھے وہ بیکار ہو گئے

مرکز کی طرح جب کوئی ثابت قدم رہا
چکر نصیب کے خط پرکار ہو گئے

بدخوابیوں میں نظم شب عمر کٹ گئی
غافل کبھی رہے کبھی ہشیار ہو گئے

۴۷

آخر ہوا شباب وہ صحبت نہیں رہی
لو صبح ہو گئی شب عشرت نہیں رہی

پچھلے کی چاندنی میں یہ سر کے سفید بال
جاڑوں کی دھوپ میں وہ حرارت نہیں رہی

سیماب کشتہ ہو گیا کافور شیب سے
بے چین دل وہ شوخ طبیعت نہیں رہی

سکتہ میں بھی نہ آئینہ دکھلائیں چارہ گر
اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی

دلکو سنبھالی رہتی تھی پہلے ہمیں اور اب
خود کو سنبھالنے کی بھی طاقت نہیں رہی

مانند ابر گو کہ سراپا بخار ہیں
مانند برق نبض میں سرعت نہیں رہی

تلوؤں کو شوق خار مغیلاں نہیں رہا
سر میں ہوائے وادی وحشت نہیں رہی

وہ انتظار وصل کی شب کا گذر گیا
وہ بیقراری شب فرقت نہیں رہی

ماتم ہی ہم شباب کا کرتے تمام عمر
مجبور ہیں کہ ہاتھ میں طاقت نہیں رہی

ہی کچھ دنوں کا ذکر کہ جینے کی تھی بہار
لیکن اب اس چمن میں طراوت نہیں رہی

ہی کچھ دنوں کا ذکر کہ شیریں بہت تھی زیست
لیکن اب اس شکر میں حلاوت نہیں رہی

ہی کچھ دنوں کا ذکر کہ تھی رخ پہ آب و تاب
لیکن اب آئینہ میں وہ طلعت نہیں رہی

گفتار میں مزہ ہی نہ رفتار میں ادا
باقی وہ بول چال میں لذت نہیں رہی

اب یہ فروتنی یہ تواضع یہ انکسار
وہ نخوتیں وہ شان وہ شوکت نہیں رہی

لبریز ہو چکا ہے جو پیمانہ عمر کا
جام شراب ناب پہ رغبت نہیں رہی

جاتا رہا شباب رہا غم شباب کا
باقی رہا عذاب قیامت نہیں رہی

بالیں پہ آکے ناز سے کہتی ہے یہ اجل
کیوں اب تو سچ کہو کوئی حسرت نہیں رہی

بولی یہ روح قالب خاکی کو چھوڑ کر
دامن پہ گرد وادی غربت نہیں رہی

ان ابروؤں سے راہ حقیقت ملی مجھے
اب دو کمان کی مسافت نہیں رہی

خلوت جو چاہتا ہی تو حید خودی کو چھوڑ
خلوت میں ما و من ہو تو خلوت نہیں رہی

۱۴۸ میں دیکھتا ہی رہ گیا وہ چال چل گئے
پہلو سے دل نکال کے تلووں سے مل گئے

حسرت سے دیکھنے پہ وہ کیسا بدل گئے
آخر نہ قتل کرکے بھی تیوری سے بل گئے

ناوک بھی تیری کرتے ہیں بے اعتنائیاں
آئے ادھر ہی اور ادھر سے نکل گئے

یکساں ہے اب نشیب و فراز جہاں ہمیں
جاتا رہا شباب تو سانچہ میں ڈھل گئے

منزل کا شوق اپنے لیے خضر راہ تھا
تھک تھک کے لاکھ بار گرے پھر سنبھل گئے

سیل فنا میں دونوں کے دونوں تھے بے ثبات
آکر حباب چشم خ سے ٹوپی بدل گئے

سید اصلاح ہے برگ درختان سبز سے
آئے یہاں سب اور کف افسوس مل گئے

ہے کارساز گریۂ اضطراب برق
تڑپا جو دل تو آنکھ سے دریا ابل گئے

حیران ہوں کہ ڈھونڈ کے لاؤں کہاں سے ؟
جو ولولے شباب کے دل سے نکل گئے

عالم کو پھر سرا نہ کہیں ہم تو کیا کہیں
آنا ہے یہ بھی کوئی کہ آج آئے کل گئے

گردش میں مہر و ماہ کی جلوہ فروشیاں
کھوٹے درم بھی عالم فانی میں چل گئے

قارون تو سر پہ گنج گراں مایہ لے گیا
ایسے بھی لوگ گذرے ہیں جو سر کے بھل گئے

بے دیکھے آگیا ارنی گو کو غش یہ عشق
آئے وہ اور آنکھ بچا کر نکل گئے

ہم دل جلوں کے حال کا پروانہ ہے گواہ
پہنچے قریب اسقدر اور ہوکے جل گئے

نادان ہیں جنکو قالب خاکی کی غرض ہے
مٹی کا مل گیا جو کھلونا بہل گئے

شانہ بھی شب کو بزم میں زلفوں کی تھا شریک
کیا ٹوپیوں کا ذکر عمامے اچھل گئے

میدان امتحان میں تھے کتنے ہی بلہوس
ٹھہرا گیا نہ زد پہ وہ آکر نکل گئے

کیا خوف کاتبانِ عمل کا بہار میں
جب دل پہ رکھ لیا نہ رکیں گے کسی طرح
رہتے تھے جو سپیدۂ خلق سے قید میں
عمریں جنھوں نے گوشۂ عزلت میں کاٹ دیں
کس نے یہ کہہ دیا ہے ماتم میں رو دیئے
شغل ہے اہلِ درد کا کافر کے زیرِ بام

ساقی وہ رت بدل گئی پیر بدل گئے
پھر کوہسار سامنے آئے تو ٹل گئے
لے کر لحد میں ساتھ نہ اونچے محل گئے
بیٹھے ہی بیٹھے وہ تو بڑی چال چل گئے
نرگس کے پھول دستِ نگاریں سے ڈھل گئے
دیکھی جو اک جھلک تو کلیجے مسل گئے

اے نظمؔ عشق اور ہوس میں یہی فرق ہے
بیمار میرے ساتھ کے اکثر سنبھل گئے

۴۹

دل اس کے سامنے ہے وہ ہے دل کے سامنے
بیٹھے ہیں ہم حسینوں کی محفل کے سامنے
ٹھہرا جنازہ گور کی منزل کے سامنے
ہو گی مجھی پہ تیغ لگانے کی ابتدا
اچھے رہے وہ راہِ وفا میں جو مٹ گئے
غنچہ کا دل بھی آہ سے خالی نہ تھا مگر
تیغِ نگاہ ایک خریدار سیکڑوں
ہم خاک ہو کے بھی نہ رکے راہِ شوق میں

۱۷

پردہ جو ہٹ تو آنکھ کے اک تل کے سامنے
کوئی تو آئے گا کششِ دل کے سامنے
کشتی بس اب پہنچ گئی ساحل کے سامنے
پہلے پہل چلا ہوں میں قاتل کے سامنے
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں منزل کے سامنے
سنتا ہے کون شورِ عنادل کے سامنے
چھریاں چلیں گی دیکھنا قاتل کے سامنے
آ پہنچے اور بیٹھ گئے منزل کے سامنے

دیکھا رگِ سحاب میں بجلی کا اضطراب
اک نبضِ ناتواں تپشِ دل کے سامنے

شرمِ وفا کا پاس ہے رمزِ کشتگانِ عشق
تیوری چڑھے پہ ہے نہ خنجرِ قاتل کے سامنے

قبلے کے رخ گیا ہے لبوں تک پہنچ کے دم
اُلٹی چلی نہ سانس بھی منزل کے سامنے

کیسی نگاہِ یاس نے تصویر کھینچ لی
قاتل کا منہ اتر گیا بسمل کے سامنے

بھولے ہوئے کو یاد دلانے سے فائدہ
کیوں دل کا نام لیتے ہو بیدل کے سامنے

اے ساربانِ ناقۂ سلمیٰ بہوش باش
اُڑ اُڑ کے خاک آتی ہے محمل کے سامنے

میری سپر اٹھی یہ جو کلوا دیا مجھے
گستاخیاں بھری ہوئی محفل کے سامنے

ابرو کا حسن دیکھتے ہی چھپ گیا ہلال
ٹھہرا گیا نہ بدرِ مقابل کے سامنے

اے نظمؔ مجھ سے پوچھ دلِ قیس کی خبر
دیکھا تھا لوٹتے کسی محمل کے سامنے

۱۵۰ — ۲۴

نشہ میں سوجھتی ہے مجھے دور دور کی
ندی وہ سامنے ہے شرابِ طہور کی

خدمت ہی شغلِ باغِ گلشن طیور کی
ازبر ہیں عندلیب کو سطریں زبور کی

ہنگامِ وعظ عشوہ گری بے سبب نہیں
واعظ ترے خیال میں جنت ہے حور کی

ان زاہدانِ خشک کو حصہ اگر ملا
مٹی ہوئی خراب شرابِ طہور کی

میدانِ حشر میں مرے نالوں کے سامنے
بیٹھی ہوئی نکلتی ہے آوازِ صور کی

تکیہ ہوا پہ شانِ سلیماں ہو آ گیا
فلک و روزہ چھاؤں نے ہے بالِ طیور کی

جاؤں گا مدرسہ میں نہ میں خانقاہ سے
رستے وہ سب ہیں پھیر کے راہیں ہیں دور کی

پائی ہے تیری دیکھنے والے نے وہ نگاہ
جھپکی ذرا نہ آنکھ تجلی سے طور کی

اوٹھے اگر تو سیکڑوں فتنے اوٹھا کے آپ
بیٹھے اگر کہیں تو شرارت ضرور کی

پڑھنے سے میرے خط کے بھی اوسکو حجاب ہے
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں جو بین السطور کی

کشتی مری بندھی ہوئی پانی میں ہے پڑی اس
گرداب غم کی فکر نہ موج سرور کی

سجدہ بھلا بتوں کو میں کرتا محال تھا
تصویر سے کھنچی ہوئی تیری غرور کی

ہمت سے اہل جذب کی قائم ہے آسماں
اس خیمہ سیہ میں طنابیں ہیں نور کی

ساقی لگا دے کشتی بادہ کنار آب
دریائے غم سے فکر مجھے ہے عبور کی

سردی سے ہم فقیروں نے مرنا کیا قبول
لیکن نہ کھال کھینچ کے پہنی سمور کی

فاقے گذر رہے ہیں جو اک پیرزال پر
طوفان نوح کیوں نہ خبر لے تنور کی

لو اس کے سامنے بھی ہیں بے تابیاں وہی
نکلے گی آج لاش دل ناصبور کی

سمجھا ہیں آئینے سے جو ہوتے ہیں مشورے
بیٹھے ہوئے بنائیے باتیں فتور کی

خوں کر دیا ہے فندق رنگیں نے لعل کو
ساعد نے پھیر دی ہے کلائی بلور کی

گلشن کو دیکھتا ہوں میں نرگس کی آنکھ سے
سنتا ہوں گوش گل سے کہانی طیور کی

مجھ کو یہ آسماں کی دورنگی سے ہے یقیں
دن آ رہے ہیں عیش کے راتیں ہیں ہجر کی

اس پیر میکدہ کی نظر پر جو چڑھ گیا
چوٹی دکھائی دینے لگی کوہ طور کی

اس سال کربلا کی جو رخصت ملی مجھے
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اے نظم دیکھ لیجیو گا ہم جو کہتے ہیں
پھر اُس سے بات آپ نے کی اور ضرور کی

۱۵۱ — ۱۹

دل میں شرارت اوسکی سمائی ہوئی سی ہے
کچھ آگ دشمنوں کی لگائی ہوئی سی ہے

صورت عتاب کی سی بنائی ہوئی سی ہے
او حیلہ جو ہنسی تجھے آئی ہوئی سی ہے

بادِ صبا یہ چال اوڑائی ہوئی سی ہے
ساری ادا کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا
جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے

میں کس طرح فلک کے ستم کا گلہ کروں
یہ چال تو کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے

شاہانِ سرفراز کا اتنا تو ہے نشان
کچھ گرد آسمان پہ چھائی ہوئی سی ہے

دلکش کچھ اس طرح کی صدائے الست تھی
کانوں میں آجتک جو سمائی ہوئی سی ہے

منزل اوسے سمجھ کے گھر کھولتے ہیں ہم
بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

پہلے تو اضطراب تھا دل کو اس قدر
بجلی یہ آسماں کی گرائی ہوئی سی ہے

رنگیں ہی میرے قتل سے دامن بھی یار کا
تلوار بھی لہو میں نہائی ہوئی سی ہے

پانی نہ مانگا کشتۂ شمشیر ناز نے
افعی کے زہر میں یہ بجھائی ہوئی سی ہے

آمد نے ظلمتِ شبِ ہجراں کی دن سی آج
تاریکی آفتاب پہ چھائی ہوئی سی ہے

جلسہ تو ہوگا عید میں دورِ شراب کا
سرخی ابھی سے چہرہ پہ چھائی ہوئی سی ہے

اس بت کی دید کو نظر پاک میں ہے شرط
وہ آنکھ آئینہ کی لگائی ہوئی سی ہے

نالے اُسی طرف ہیں رواں آہ اُسی طرف
جانِ حزیں فلک کی ستائی ہوئی سی ہے

زلفیں بھی حلقہ حلقہ ہیں کاکل بھی پیچ پیچ
آنکھوں میں وہ یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

فصلِ بہار آ گئی اک جام پیتے ہی
ساقی گھٹا جو آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے

سمجھو اسے ہنر ہوئی شاعر کا ہی کلام
جس شعر میں کہ بات بنائی ہوئی سی ہے

آساں ہے نظم ترکِ ملاقات خلق سے
لیکن بری یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

۱۵۲ ——— ۱۰

تنہا نہیں ہوں گر دلِ دیوانہ ساتھ ہے
وہ ہرزہ گرد ہوں کہ پریخانہ ساتھ ہے

ہنگامہ اک پری کی سواری کا دیکھنا
کیا دھوم ہے کہ سیکڑوں دیوانہ ساتھ ہے

دل میں ہیں لاکھ طرح کے حیلے بھرے ہوئے
پھر مشورہ کو آئینہ و شانہ ساتھ ہے

روزِ سیہ میں ساتھ کوئی دے تو جانیے
جب تک فروغِ شمع ہے پروانہ ساتھ ہے

دیتا نہیں ہے ساتھ تہی دست کا کوئی
جب تک کہ مے ہے شیشہ میں پیمانہ ساتھ ہے

سیکھا ہوں میکدہ میں طریقِ فروتنی
جب تک کہ سر ہے سجدۂ شکرانہ ساتھ ہے

جو بے بصر ہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں دور دور
اور ہر قدم پہ جلوۂ جانانہ ساتھ ہے

کیا خوف ہو ہمیں زنِ دنیا کے مکر کا
اپنی مدد کو ہمتِ مردانہ ساتھ ہے

غم کی کتاب ہے دلِ صد پارہ کم نہیں
جس بزم میں گئے ہی افسانہ ساتھ ہے

مانندِ گردباد ہوں خانہ بدوش میں
صحرا میں ہوں مگر مرا کاشانہ ساتھ ہے

۱۵۳ — ۱۵

باندھے تھے ان کے ہاتھ لگا کر حنا کبھی	کھولے تھے تیر چھیڑ چھیڑ کے بند قبا کبھی
فریاد و آہ سے نہ مرا دل بھرا کبھی	فوراً اٹھائے درد جو بیٹھا گلا کبھی
تھی ہم سے آپ سے نہ ملاقات کیا کبھی	یوں پھر گئے کہ جیسے نہ تھے آشنا کبھی
عالم کو قتل کیجیے ترچھی نگاہ سے	یہ ہے وہ تیر جو نہیں کرتا خطا کبھی
کعبہ سی بتکدہ میں گیا خیر ہو گئی	زاہد یہاں قبول نہ ہوتی دعا کبھی
اب اشک گرم آتے ہیں ساتھ آہ سرد کے	ایسی تھی برخلاف نہ آب و ہوا کبھی
دیکھا تھا اک نظر کہ چلے سو نگہ کے تیر	کہتا رہا کہ اب سے نہ ہو گی خطا کبھی
تھا اوسکی میری بیچ میں دریا کے آئینہ	اوس پار اس طرف کی نہ پہنچی صدا کبھی
گرداب میں جب آگئی کشتی تو سمجھے ہم	ساحل پہ یاد ہی نہیں آیا خدا کبھی
اس بزم میں جلائے گئے ہم شمع کی طرح	نکلا زبان سے نہ برا یا بھلا کبھی
گویا کہ زخم تھا میں دل روزگار کا	رویا کبھی تو حال پر اپنے ہنسا کبھی
بے وجہ ہو کسی کی برائی میں جو کوئی	اس کا بھی اس جہاں میں نہ ہوگا بھلا کبھی
زانو پہ مار ہاتھ کہ پتھر سے پھوڑ سر	مٹتا نہیں نصیب کا غافل لکھا کبھی
ظلمات میں تو جا کے نکل آئے تھے خضر	کوچہ میں زلف کے نہ ملے گا پتا کبھی
چشمے کبھی بہائے نہ پیا دگا کبھی ہزسبر	تیرا قلم عصا تھا کبھی اژدہا کبھی

۱۵۴ — ۷

کیا طرفہ عاریت نفس مستعار ہے
جس کی بقا کا آمد و شد پر مدار ہے

چرخ کوکب ایک نمود شرار ہے
ہستی سے جو کہ تا بہ عدم بے قرار ہے

چھوڑے نہ راستی کا کبھی راستہ بشر
ہونے دے گر عدو فلک کج مدار ہے

پتھر میں گھر بنایا ہے تو نے جو اے شرار
آخر بنائے عمر بھی کچھ پایدار ہے

ہے یہ صدا شکست میں جام حباب کی
طرز طلسم یہ نفس مستعار ہے

ہونے کو اب ہے چاک گریبان آہ میں
انداز پر فشانی باد بہار ہے

فکر رسا کی ہیں قدر انداز یاں عجیب
جو طائر خیال ہے اس کا شکار ہے

۵۵ —— ۱۱

نظروں سے تو نہاں وہ مثال نظر رہے
آنکھوں میں پتلیوں کی طرح جلوہ گر رہے

ہے آنکھ وہ کہ عیب پہ اپنی نظر رہے
ہو وہ ہنر کہ اشک ندامت سے تر رہے

دو دن سرائے دہر میں آ کر اتر رہے
کہنے کو سب کہیں گے یہی عمر بھر رہے

کہتی ہے اے صبا یہی آہستگی کی چال
تو چاہتی ہے باغ میں دم بھر ٹھہر رہے

آیا نہ کچھ جواب تو قاصد پھرا کوئی
خط لے کے جو گئے تھے وہیں جا کے مر رہے

کیسا خیال ضبط نے رسوا کیا مجھے
نوک مژہ پہ اشک کے قطرے ٹھہر رہے

دم بھی رواں ہوا گر افشائے راز ہو
بس کاروان آہ مرا ہم سفر رہے

پڑھ لو لکھا ہے صاف خط تیغ یار میں
ہم معرکہ میں عشق کے سینہ سپر رہے

میں نے کبھی یہ پڑھی جو دعائے ہلال بھی
ابرو کسی حسین کے مد نظر رہے

خورشید پر یہ خندۂ دنداں نما ہوا | شبنم کے اشک گل پہ جو وقت سحر رہے

اے نظم ساتھ چھٹ نہ سکا اہل ذوق کا
جب وہ قدم اٹھا کے چلے ہم ٹھہر رہے

۱۱ ——— ۱۵۶

میں ہی رہا نہ اے شب عشرت نہ تو رہی | رونے کو لاش پر جو رہی آرزو رہی
وقت سحر نہ بزم طرب رو برو رہی | اک میں گرفتہ دل رہا اک آرزو رہی
سمجھے گے تم نہ بات نہ مانوگا میں کبھی | میرے تمہارے حشر پہ اب گفتگو رہی
خلوت میں آئینہ نے بھی دیکھا ترا جمال | او بیوفا رہی تو مجھے آرزو رہی
جھگڑا تمام ہو گیا پہلی نگاہ میں | اچھا ہوا کہ جان گئی آبرو رہی
دل میں مرے ہوا و ہوس کی جگہ نہ تھی | ناخواندہ میہماں کی طرح آرزو رہی
حیرت سے اپنی درس خموشی ملا مجھے | طوطی کو آئینہ سے اگر گفتگو رہی
عالم میں اے اجل نہ کوئی تھا رفیق بلد | میں تیرے ساتھ اور مرے ساتھ تو رہی
نکلیگی تن سے روح خدا جانے کس طرح | گر وقت نزع کشمکش آرزو رہی
بخشش کا حکم ہو گیا رحم اس کو آ گیا | جب تھوڑی دیر لاش مری قبلہ رو رہی

بیگانہ تھی یہ آمد و رفت نفس بھی نظم
ہر ایک ذی حیات کو کچھ جستجو رہی

۱۵ ——— مفعول فاعلاتن دو بار ——— ۱۵۷

خاموش ہیں فغاں سے لب آشنا نہیں ہے
اوس کارواں میں ہیں ہم جس میں درا نہیں ہے
کچھ آرزو نہیں ہے کچھ التجا نہیں ہے
پائے طلب نہیں ہے دستِ دعا نہیں ہے
بندہ ہے رند مشرب کچھ پارسا نہیں ہے
پھولوں میں بو رہے گی بوئے ریا نہیں ہے
پھینکی کمند کیونکر قمری کے آشیاں پر
سروِ چمن کا طرہ اتنا رسا نہیں ہے
ہے گلبن شگفتہ عہدِ شباب لیکن
رنگِ بقا نہیں ہے بوئے وفا نہیں ہے
نکلے جو میرے دل سے میری نہیں تمنا
پیدا اثر ہو جس میں میری دعا نہیں ہے
کیوں تیری رہگذر میں بیمار سر نہ پٹکیں
تعویذِ دردِ سر ہے یہ نقشِ پا نہیں ہے
بلبل کو عشقِ گل میں کیا خاک لطف ہو گا
تیرِ نگہ نہیں ہے تیغِ ادا نہیں ہے
نا اہل و دل نہ اتنے پھیلائیں پاؤں اپنے

یہ کارواں سرا ہے دولت سرا نہیں ہے

کیا جانے درد ہجراں کیا جانے آہ سوزاں
ناصح مری طرح سے تو مبتلا نہیں ہے

یہ دل ودیعتِ حق اور معرفت سے خالی
آئینہ تو ہے لیکن اس میں جلا نہیں ہے

جاتی ہے غمزدوں کی فریاد اوپر اوپر
گنبد میں آسماں کے شاید صدا نہیں ہے

حیرت کا میری باعث جلوہ ہے خود تمہارا
تم آئینے سے پوچھو میری خطا نہیں ہے

کہنے سے تیرے ناصح چھوڑوں میں ہرزہ گردی
تیری طرح سے میرا کچھ سر پھرا نہیں ہے

تسلیمؔ آج ڈھونڈنے کو اس کے چلا تھا گھر سے
کھویا گیا خود ایسا جس کا پتا نہیں ہے

۱۵۸ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات ۱۴

بسانِ نکہتِ گل ساتھ ہم صبا کے چلے
فضائے دہر میں ہم مثلِ برق آ کے چلے

رواروی میں ہیں ہم سن لو قافلہ والو
ہے آشنا وہ جو کہنے پہ آشنا کے چلے

تڑپ کے کاٹ دیا وقت مسکرا کے چلے
کہ جن کو ساتھ ہو دنیا قدم اٹھا کے چلے

نمود رعشۂ پیری ہوا اجل آئی
چراغ صبح تھے گویا کہ جھلملا کے چلے

نثار ہوجیے اس دل پہ جو ہو صاحب درد
وہ پاؤں چومیے جادہ پہ جو وفا کے چلے

یہ کیسا حسن کا نشہ یہ بول چال ہے کیا
زبان بہک کے چلے پاؤں لڑکھڑا کے چلے

سنا ہے برق کو اک لاگ ہے بلندی سے
بشر نہ حد سے زیادہ بھی سر اٹھا کے چلے

خدا کے واسطے اے صبر و تاب و ہوش و خرد
کہاں چلے کہ مجھے بیڑیاں پنہا کے چلے

یہ دیکھتا ہوں کہ ہے دل کی لاش اور میں ہوں
خبر نہیں یہ مجھے وار کب ادا کے چلے

کبھی جو آگئے تکیہ پہ ہم فقیروں کے
دعائیں سن کے چلے کوسنے سنا کے چلے

نظارہ جس کا ہو عالم کو مایۂ حسرت
وہ راستہ میں نہ کیوں اپنا منہ چھپا کے چلے

جب اپنی آنکھ ہوئی بند سب کی آنکھ کھلی
جو گہری نیند میں تھے ان کو ہم جگا کے چلے

دکھا میں اور ادا دے اے نظم تیری باتوں نے
رقیب جل کے اٹھے پیچ و تاب کھا کے چلے

۱۵۹ ——— ۸

اگر تو آرزوی خدمت مغان داری
بیار از دل و دین آنچہ ارمغان داری

اگر درنگ و تامل کنی زیان بر تست
کہ صید بر ہدف و تیر در کمان داری

زمانہ در شفق خون ہلال تیغ نو دید
تو آسمان دگر زیر آسمان داری

تو قریب تر از تو حریم جانانست
ولیک نفس خودت را تو در میان داری

درین طلسم حوادث تو از چہ افتادی
کہ منزل آن طرف دور آسمان داری

گدائے کوچۂ محبوب را ہمی زیبد
شکست طرف کلہ شوکت جہانداری

خضر بہ حالت تنہایت دلم سوزد
چہ لطف زیست کہ اندوہ جاوداں داری

بنال نظمؔ کہ ایں بزم میگسارانست
شراب درد تو در شیشۂ فغاں داری

١٦٠ ١٨

کتاں کی طرح جو نازک جگر نہیں رکھتے
وہ ذوق جلوۂ حسن قمر نہیں رکھتے

نہ دے سکیں گے ہمارا ساتھ رہروان طریق
وہ یوں قدم دم شمشیر پہ نہیں رکھتے

سفینہ اپنا ہی صبر و رضا کے ساحل پر
امید و بیم کے طوفاں کا ڈر نہیں رکھتے

یہ راستی یہ تواضع جو سرو و بید میں ہے
شجر ہیں اور بھی ایسا ثمر نہیں رکھتے

مریض غم کو خوشی کیا جو ہے سحر نزدیک
کہ چارہ گر تو امید سحر نہیں رکھتے

اوڑا دی ای قدر افگن لگا کے تیر کوئی
ہوس ہے اوڑنے کی اور بال و پر نہیں رکھتے

وہ لوگ جو ہیں رہِ مستقیم کے سالک
قدم اودھر نہیں رکھتے اودھر نہیں رکھتے

فروتنی سے کیا سرکشی کو یوں پامال
کہ جانتے ہیں کہ ہم تن پہ سر نہیں رکھتے

فلک زدہ ہیں شب غم کے جاگنے والے
سوائے رنگ پریدہ سحر نہیں رکھتے

عزیز خلق وہی خوش نصیب ہیں جو لوگ
سر غرور و دل کینہ نہیں رکھتے

ستارہ ریزی شام طرب میں محو ہیں جو
نفس گدازی یاد سحر نہیں رکھتے

ہمیشہ لالہ کے مانند لب ہے پر خندہ
مگر شکایت داغ جگر نہیں رکھتے

دماغ اپنا بھی ہے لامکان پر لیکن
فلک کی طرح سے دوران سر نہیں رکھتے

گلوں کو بھی دل و دعویٰ ہے نغمہ سنجی کا
زبان حال کی بلبل خبر نہیں رکھتے

دکھاؤ ناگاہ اونھیں میں جاکے چاک جیب شکیب
کہ زعم ہے نگہ پردہ در نہیں رکھتے

فغاں میں بلبل شیدا کے نیشتر ہوں تو کیا
جو کوچہ رگ گل میں گذر نہیں رکھتے

فروغ بخش ہے چشم محبت احباب
شعاع مہر ہے تار نظر نہیں رکھتے

اونھیں کے حلقہ کا ناظم جرعہ نوش ہوں میں
خبر کچھ اپنی بھی جو بے خبر نہیں رکھتے

۱۶۱ ۱۷

جہان کس کا ہے عمر گریز پا کس کی
یہ چلتی چھاؤں ہے ہوتی ہے آشنا کس کی

نگاہ اس سے لڑی دل کا غیر حال ہوا
گناہ کس نے کیا آگئی قضا کس کی

وفور رشک سے محفل میں کہہ نہیں سکتا
لگا رہی ہے مجھے برچھیاں ادا کس کی

عدو ہی در پئے جان دوست در پئے دل ہے
بیان کس سے کروں جاکے میں جفا کس کی

ٹپک پڑے ہیں جو مجنوں کے ذکر پر آنسو
یہ سچ بتا تجھے یاد آگئی وفا کس کی

مجھی پہ رکھتے ہیں الزام میرے ہی غمخوار
برا کہے اسے طاقت ہے یہ بھلا کس کی

کسی طرح نہیں جاتا خیال زلف و کمر
یہ کیا ہوا مرے پیچھے پڑی بلا کس کی

وہ آکھڑا ہوا بالین پہ اور میں اٹھ بیٹھا
کدھر کا ضعف کہاں کا مرض دوا کس کی

قدم پہ اس کے گرا سامنے ہی ناصح کے
لحاظ کیسا کہاں کا ادب حیا کس کی

ہوا تھا سایۂ دیوار میں گذر کس کے
اوڑالی تو نے سعادت پر ہما کس کی

سبک روی میں بھی غنچوں کے دل مسل ڈالے
یہ تیری چال میں شوخی ہے اے صبا کس کی

یہ کس حسین کی آن ملی تجھے اے گل
ترے گلے میں ہے مسکی ہوئی قبا کس کی

یہ تیری عشوہ گری بے سبب نہیں نرگس
کھبی ہوئی تری آنکھوں میں ہے ادا کس کی

یہ تو ہمہ تن گوش کیوں ہے اے شگوفۂ باغ
یہ گونجتی ہے ترے کان میں صدا کس کی

چمن میں جھومتے دیکھا ہے شاخِ گل تجھ کو
بلائیں لیں ترے ہاتھوں نے بارہا کس کی

یہ کس کے شوق میں اس کا جگر ہوا ہے لہو
پڑے پسے ہوئے پامال ہے حنا کس کی

عبث ہے آپ کو تغییرِ حال کا رونا
جنابِ نظم رہی ایک سی سدا کس کی

۱۶۳ ۱۷

رقیب کہتے ہیں آوازِ شر یہ کس کا ہے
میں چپ رہوں نہ مجھے فتنہ گر یہ کس کا ہے

بجائے دیر میں واعظ یہ شب کو کیا گذری
کہ ایک بت تو تمھارا نہ دوں میں یہ کس کا ہے

نہ ساتھ لایا ہے کوئی نہ لے کے جائے گا
نہ بھول اس پہ ارے مال و زر یہ کس کا ہے

وہ زمزم ہیں کہ جو تجھ تجھ کے کہتی ہے دوزخ
خدا کے واسطے داماں تر یہ کس کا ہے

جو دل جدا ہوا پہلو سے دل کا غم تو ہے
جو وہ نہیں نہ سہی شکر کر یہ کس کا ہے

ابھی ہو روٹھ کے تم [illegible] شوق سا دیکھ لیا
یہ کس نے بات کی پھر منہ ادھر یہ کس کا ہے

جہاں ہوا ہے [illegible] کسی کے عاشق ہی
گر اپنے گھر کو یہ کہتا ہوں گا یہ کس کا ہے

یہ کب کے دوست ہیں پھر کیوں اسے پوچھتے ہیں
کہ داغ خون تری تلوار پر یہ کس کا ہے

ٹھہر کے غیر سے کیسا نکل گئے ہو تم ۵
یہ آگ کس کی لگائی ہے شرر یہ کس کا ہے

لگاؤ تم اسے چھریاں کہ پائمال کرو
قسم تو ہم سے جو پوچھیں جگر یہ کس کا ہے

ادا کا وار بھی چل جائیگا خبر تمھی کے
میں دیکھتا تھا کہ تیر نظر یہ کس کا ہے

بنایا سرمہ دنبالہ دار کو جو سمند
شکار آپ کو مد نظر یہ کس کا ہے

نہ منہ لگاؤ رقیبوں کو ہم نہ کہتے تھے
زباں بگڑ گئی دیکھو اثر یہ کس کا ہے

غرض سبھی کا ساری ہی بزم عیش میں بھی
خبر ہی جام [illegible] سر یہ کس کا ہے

کھلا نہ خانہ تن کا بھی اپنے کچھ اسرار
کہ اس مکان میں آخر گذر یہ کس کا ہے

اگر اجل سے ڈریں بھی تو کیا سمجھ کے ڈریں
یہ انتظار ہمیں عمر بھر یہ کس کا ہے

تو روز حشر بھی ہیں نشہ میں حور ہی انظم
خدا کے سامنے اے بے خبر یہ کس کا ہے

۱۶۳ ——— ۱۶

نہ اتری بام سے جب تک دوپہر گذرے
ہم ایسے سایہ دیوار سے بھی در گذرے

جو وار کرتا ہو سفاک کو تو کر گذرے
کہ آپ تیغ کہیں سر پہ ہاتھ بھر گذرے

جہاں کی سیر میں انسان بے خبر گذرے
بسان ابر ہو لازم بچشم تر گذرے

کمند آہ کو پھینکوں میں بام گردوں پر
جو گیسوئے شب دیجور تا کمر گذرے

ہماری غنچہ دل سے وہ پھول ہی اچھے
جنھیں ترنم گیسو میں رات بھر گذرے

نشانہ غیر کو تو نے بنایا تھا جن کا
وہ سب خدنگ مرے دل سے ہی تیر گذرے

تڑپ کے رہ گیا کوئی تو اس کو کیا پروا
کرشمے اپنے نگاہوں سے بیشتر گذرے

غم و الم کی جو راتیں ہیں وہ نہیں کٹتیں
خوشی کے دن تو ادھر آئے بس ادھر گذرے

فقیر ہیں نہیں جھکتے مگر کسی سے ہم
اسی روش پہ سلاطین تاجور گذرے

بہکتا رہ گیا واعظ طریق عرفاں میں
خضر کبھی نہ ادھر راہ بھول کر گذرے

گہر سمجھ کے اٹھا لیتے خاک سے ہم کو
نہ اس طرف سے کبھی صاحب نظر گذرے

نہ ہم نے ہاتھ سے سر رشتہ وفا چھوڑا
ہزار ظلم و ستم ایک جان پر گذرے

بنا ہر ایک نفس برق خرمن ہستی
جنوں میں آپ سے جب صورت شرر گذرے

دلوں میں گھر ہے زبانوں پہ ذکر ہے اب تک
کہیں نشاں نہیں ان کا جو نامور گذرے

جو سمجھے حرمت میخانہ تو تو اے واعظ
ادھر سے گذرے تو احرام باندھ کر گذرے

مجھے بھروسہ ہے ناظم اوس کی رحمت کا
یقین ہے میرے گناہوں سے وہ بھی در گذرے

١٦٤ — ١٩

شب فراق میں کب تک قضا نہیں آتی
میں دیکھتا ہوں کہ کیونکر بلا نہیں آتی

نگہ کے چلتے ہیں تیر اور صدا نہیں آتی
یہ سنتے آئے ہیں لیکر قضا نہیں آتی

یہ کس ادا سے پریشاں ہوئے ترے گیسو
کہ جیسے ہوش میں باد صبا نہیں آتی

ترا شہید محبت ہے زندہ جاوید
جنازہ اٹھ بھی گیا اور قضا نہیں آتی

بلاکشانِ غمِ عشق کو مبارک ہو
کہ دردِ دل کی کسی کو دوا نہیں آتی

جو پوچھ رازِ حقیقت تو پوچھ رندوں سے
کہ اس طرف کی خبر جا بجا نہیں آتی

غرورِ حسن بتوں کا وہ کوہِ تمکیں ہے
پکارو لاکھ پلٹ کر صدا نہیں آتی

نہ سیکھے گا کہیں آئینہ سے بے شرمی
کہ اوس کی آنکھ میں مطلق حیا نہیں آتی

جفا کا ذکر جو چھیڑا کہا نہیں سنتے
وفا کو اوس سے جو پوچھا کہا نہیں آتی

جواب صاف ملا ہر طرف سے قاصد کو
اجل بھی ناز سے کہتی ہے جا نہیں آتی

تمہیں نہ جہاں کے حسینوں سے لے گئے بازی
کسی کو چال تمہارے سوا نہیں آتی

غم و الم کا ہے رونا نہ درد کا ہے گلہ
مجھے شکایتِ اہلِ وفا نہیں آتی

نہ جانے بچھڑے ہوئے دوست پھر ملیں نہ ملیں
وہ راہ ہے کہ صدائے درا نہیں آتی

شبِ فراق میں ہے آہِ نارسا سے عجب
کہ آگ خرمنِ مہ میں لگا نہیں آتی

خدا کے سامنے جاتے ہو کس طرح دیکھیں
کسی سے شرم تمہیں تو ذرا نہیں آتی

پیام لا کے کسی کا یہ ہو گیا ہے غرور
بغیر ناز کئے اب صبا نہیں آتی

کریں گے دہر سے کیا شکوہ نامرادی کا
ہمیں کو خود طلبِ مدعا نہیں آتی

اثر کے عرشِ بریں سے مراد آتی ہے
یہاں زبان سے لب تک دعا نہیں آتی

جو منع ہوتیں یہ مستیاں بہار میں نظمؔ
تو جھوم جھوم کے کالی گھٹا نہیں آتی

نکالے پیچ مجھی پر مرے سکھائے ہوئے
چلے مجھی پہ وہ فقرے مرے بتائے ہوئے

چلے گا سرو جو دامن کو یوں اٹھائے ہوئے
کہوں گا منھ پہ یہ انداز ہیں اڑائے ہوئے

جو بزم انس میں ہیں تجھ سے لو لگائے ہوئے
تمام خلق سے بیٹھے ہیں منھ پھرائے ہوئے

کہو فلک سے گریباں ذرا بچائے ہوئے
چلا ہے نالۂ دل آستیں چڑھائے ہوئے

لگے جو اڑ کے آنچل تو سیکڑوں فتنے
اٹھیں گے دامن محشر میں منھ چھپائے ہوئے

کہیں چھپائے سے چھپتی ہے شب کی بے خوابی
نگاہیں کہتی ہیں جادو ہیں جگائے ہوئے

خبر کسے کوئی ان کو مری اسیری کی
جو میں ہیں بھولے چمن کا فریب کھائے ہوئے

گر آفتاب قیامت نہ گرمیاں تم سے
ہم آپ میں عرق شرم میں نہائے ہوئے

حساب ہم سے بروز شمار کیا ہوگا
کہ چند روز میں وہ بھی گئے گنائے ہوئے

جنوں نے دیر کا رکھا ہمیں نہ کعبہ کا
ٹھکانے چھوٹ گئے سب لگے لگائے ہوئے

متاع صبر و خرد اک نگاہ میں لے لی
یہ کب سے بیٹھے تھے مجھ پر ادھار کھائے ہوئے

غرور حسن غرور شباب استغنا
شراب کی ہیں کئی بوتلیں چڑھائے ہوئے

او نہیں ہے رشک حسینوں میں دیکھ کر مجھ کو
لگی ہے آگ کہ پھرتے ہیں تلملائے ہوئے

مری طرف نگہ ناز او رعتاب آمیز
نگاہ تیر بھی اور زہر میں بجھائے ہوئے

ہنسی کبھی آگئی آتش کو بزم ناز میں
ابھی تو آنکھوں میں آنسو تھے ڈبڈبائے ہوئے

گرا ہے پیر مغاں ... تجلی سے
کہ جس پہ حضرت موسیٰ ہیں حال آئے ہوئے

کیا ہے قصد تو میخانہ سے نکلنے کا
لگا ہے ہم سے ہیں مجھ پاؤں لڑکھڑائے ہوئے

[illegible]

صلہ ملے تجھے کوثر پہ اس کا اے ساقی — کہ میکدے سے چلے پیاس تم بجھائے ہوئے
وہ چاہے قتل کرے چاہے وہ رہا کردے — کھڑے ہوئے ہیں گنہگار سر جھکائے ہوئے
گلہ کروں گا نہ میں جو نصیب کا لکھا — قلم چلا ہیں بے ہاتھ کے ہلائے ہوئے
بروز حشر میں انکا مزاج پوچھوں گا — ترے جو وعدے پہ ہیں اعتبار لائے ہوئے
اب اوس شاہ کو جھک جھک کے ڈھونڈتا ہوں میں — رہ گذر جیسے خاک میں ملائے ہوئے
نظر لگے نہ کہیں آفتاب محشر کی — کفن میں لے چلے داغ وہ چھپائے ہوئے
اوٹھائے جور قیامت نہ خواب تو لحد — ستمگر شب غم کی [illegible] بچھائے ہوئے
پیالہ پینے کو مجھے ہو گر تو ہاں نہ دو — نظر سے ہیرے نشاں کی نظر ملائے ہوئے

چلا ہے نظم کہاں کشش [illegible] کی
بغل میں شیشہ دل سے [illegible] لگائے ہوئے

١٦ — ١٨

حسین ہو کے تکبر ضرور ہوتا ہے — ادا میں فتنہ نگہ میں فتور ہوتا ہے
جو ہونے والا ہے وہ تو ضرور ہوتا ہے — بری بلا ہے دل ناصبور ہوتا ہے
ہر ایک شی سے اسی کا ظہور ہوتا ہے — کہ آفتاب کا ذروں میں نور ہوتا ہے
ہر ایک قطرے میں دریا ہے کوئی کیا جانے — نہیں سمجھتے ہیں جن کو عبور ہوتا ہے
زہے غبار شہیدان حسرت و ملیک — اوٹھے تو عرش جو بیٹھے تو طور ہوتا ہے
بھلا سحر تو شب ہجر کی کہاں لیکن — کفن سپیدہ صبح نشور ہوتا ہے

ہوا بہشت کی آتی ہے جب تو ساغر میں
چھلک کے جام شراب طہور ہوتا ہے

دل اپنا آپ سے دیتا نہیں کسی کو کوئی
یہ ظلم ہوتا ہے اور بے قصور ہوتا ہے

جسے نہ ریزہ مینا کی طرح کیوں توڑیں
کوئی بھی نشہ میں اس طرح چور ہوتا ہے

قیام کب ہے جو حاصل بھی ہو فراوانی
ہوا پہ سایۂ بالِ طیور ہوتا ہے

سرائے دہر میں ہے کون آشنا کس کا
کہ صبح و شام ورود و صدور ہوتا ہے

فروتنی میں کچھ ایسی ادا نکلتی ہے
کہ انکسار پہ اپنے غرور ہوتا ہے

کیا نشیب و فراز جہاں کو جب ہموار
نہ دل میں رنج نہ پیدا سرور ہوتا ہے

نہیں علاج منافق کی روسیاہی کا
جو دل ہو صاف تو چہرے پہ نور ہوتا ہے

اودھر سے کرم پہ ہے اصرار ہم کو عصیاں پر
اودھر سے عفو ادھر سے قصور ہوتا ہے

کیا ہے اوس نے ہر اک سے وصال کا وعدہ
اس اشتیاق میں مرنا ضرور ہوتا ہے

سراب ہے جسے سمجھے ہوئے ہوں میں دریا
کہ جتنا بڑھتا ہوں اوتنا ہی دور ہوتا ہے

جنوں نے کھینچا ہے دامن مرا اودھر اے نظم
ہر ایک خار جہاں نخل طور ہوتا ہے

۱۶۷

کہے سے میرے ذرا پاس آ کے بیٹھ گئے
نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے بیٹھ گئے

کچھ اس ادا سے چلا ہے تو اوٹھ کے محفل سے
کہ دل بھی ساتھ ترے نقش پا کے بیٹھ گئے

نگاہ یاس مری کام کر گئی اپنا
رولا کے اٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

سحر کو اوٹھتے ہیں وہ دیکھ کر کف رنگیں
اب آئینہ پہ بھی سکے حنا کے بیٹھ گئے

تڑپنا دیکھ سکے وہ نہ صید کا اپنے
نشانہ تیر نظر کا لگا کے بیٹھ گئے

یہ بزم بادہ کشوں کی ہے حضرت واعظ
غضب کیا یہ کہاں آپ آ کے بیٹھ گئے

جو در پہ اس کے ٹھہرنے دیا نہ دربانے
تو سامنے در دولت سرا کے بیٹھ گئے

چلا جو تیر تو سینہ سپر کیا ہم نے
اوٹھی جو تیغ تو گردن جھکا کے بیٹھ گئے

فلک سے کیا طلب مدعا کرے کوئی
در قبول پہ پہرے قضا کے بیٹھ گئے

کھڑے ہوئے تھے سلاطین کے جو بلند مکان
عروج اپنا فلک کو دکھا کے بیٹھ گئے

گرائے ابلق ایام کب وہ گرتے ہیں
جو شہسوار پٹری جما کے بیٹھ گئے

نظر کہیں نہیں اب آتے حضرت ناصح
سنا ہے گھر میں کسی مہ لقا کے بیٹھ گئے

قدم ہی اوٹھتا نہیں میکدے سے جانیکو
ابھی اٹھے تھے یہاں سے پھر آ کے بیٹھ گئے

وہ اب کہاں ہیں جو پہلے تھا نظم ہر عالم
کہ سر پہ بار مصائب اٹھا کے بیٹھ گئے

---

١٦٨ — ٩

ہوئے نہ ہم تو پشیماں کبھی وفا کر کے
تجھے بھی شرم کبھی آئی ہے جفا کر کے

سنبھلئے حضرت زاہد یہ بزم رنداں ہے
بلا میں ہم تو پڑے آپ کی صلا کر کے

خوشی یہ ہے دم آخر تھا لب پہ نام اوسکا
کٹی ہے عمر کی منزل خدا خدا کر کے

مضیب میں ہے تو پہنچیگی بھیک گھر بیٹھے
در کریم پہ آئے چلے صدا کر کے

کسی کو حیف اس انجام کی نہیں ہے خبر — چلے جہاں سے کیا ساتھ لا کے کیا کر کے

مآل دیکھیے فوارہ کے اوچھلنے کا — خزانہ ہو گیا خالی ذرا ذرا کر کے

ہوئی جو کچھ شنوائی جہاں کو ہے معلوم — ذلیل اور ہوئے ان سے التجا کر کے

زبان شعلہ سی گلخن میں برگ گل نے کہا — خدا فقیر بنائے نہ بادشا کر کے

بڑے بڑوں کا یونہی زور ڈھے گیا نظمؔ
کوئی جہاں میں برپا ہوا جفا کر کے

١٦٩ — ١٣

مزہ بہار کا اب کے تو اے جنوں نکلے — شکست توبہ سے آوازِ ارغنوں نکلے

جو تیرے دور میں ہم اے سپہر دوں نکلے — خراب میکدہ جام واژگوں نکلے

مراد مانگنے بیٹھے کو ہم شگوں نکلے — کہیں نہ بھیس بدل کر وہ ذوفنوں نکلے

کسی کی چشم سخن گو کے جو اشارے تھے — نظر پڑی تو سب افسانہ و فسوں نکلے

ستارے شام کے ڈوبے ہوئے [illegible] — سحر کو نکلے تو با حالت زبوں نکلے

[illegible] اہل ذوق [illegible] جو عزلت گزیں [illegible] — [illegible]

دل و جگر میں نہ تھا گر وہ بھی [illegible] — [illegible]

[illegible] فلک [illegible] طرز فغاں [illegible] — کسی طرح [illegible] آتش [illegible]

اگرچہ حسن کو تھی جوئے شیر کی خواہش — پکارا عشق کہ تیشہ سے جوئے خوں نکلے

عجب نہیں ہے کہ یہاں سرکشی کرے انساں — جہاں کہ سات فلک ہو کے سرنگوں نکلے

تمہارے جلوہ کے آگے کسی کی ہستی ہے
تمہارے سامنے کس کی زبان سے ہوں نکلے

وہ شب کی دست درازی اسی نے الٹ دیے
سحر کو ہاتھ جو دیکھے تو نیلگوں نکلے

زمین شعر جواہر کی کان ہے انظم
کمال یہ ہے کہ جو مستہ سی میں کہوں نکلے

۱۸ ——— ۱۹

پہلی صبا کہ چمن میں گذر نہیں نہ سہی
کھلے شگوفہ کہ مٹھی میں زر نہیں نہ سہی

نمود بو د سراب جہاں کی فکر عبث
اگر ہے کچھ تو ہمیں کیا اگر نہیں نہ سہی

فرہ حکایت تیر نگہ میں کیا کم ہے
اگر شکایت زخم جگر نہیں نہ سہی

نہ کوئی بات کہیگا دہن نہیں تو نہ ہو
نہ کوئی نام دھرے گا کمر نہیں نہ سہی

کب اپنے حال کی مجھ کو خبر ہے اے ناصح
اگر وہ حال ہے میری خبر نہیں نہ سہی

شب ہجر صبح نہ آئے تو خواب مرگ تو آئے
سن اے فلک شب غم کی سحر نہیں نہ سہی

تمہیں تو اپنے تغافل پہ ناز ہے بارے
مجھے تحمل درد جگر نہیں نہ سہی

ٹھہر کے بزم شب ہجر دیکھ لے اے چرخ
جو ایک رات یہ دوران سر نہیں نہ سہی

چشک ہے زہر جو کلیاں تو پھول نشتر ہا
غرض کہ تجھ سے نالے اثر نہیں نہ سہی

خانہ خانہ بزابد بدنظر ور ہے ساقی
او دختر رز کہ جو ساغر ادھر نہیں نہ سہی

ابھی سے ہے سر پہ سوار او سیاہ ہے رخ یار
قدم تو اب نہیں اٹھنے کا سر نہیں نہ سہی

شہید ہونے کو رکھا ہے پاؤں مقتل یار
فقر نصیب میں یا تیغ و سپر نہیں نہ سہی

کسی کی آہ سے پتھر تو ہو چکا پانی
کسی کے دل پہ جواب بھی اثر نہیں نہ سہی

ترا خیال ہے اور میں ہوں اور دلِ بیمار
کوئی انیس کوئی چارہ گر نہیں نہ سہی

ہمارے دل میں تو ہر لحظہ ہر گھڑی ہو تم
تمہاری بزم میں اپنا گذر نہیں نہ سہی

فلک سے ہم نہیں جھکنے کے لاکھ مٹ جائیں
دماغ تو ہے وہی تاج زر نہیں نہ سہی

مزہ ہے اہلِ توکل کو روکھی روٹی کا
نمک نہیں نہ سہی یا شکر نہیں نہ سہی

یہی سمجھ کے سناتا ہوں دردِ دل اپنا
کہ جی تو بہلے گا اس کا اثر نہیں نہ سہی

مرا قلم تو جواہر اگل رہا ہے نظمؔ
جہاں میں گر کوئی حافظ نہیں نہ سہی

یہ نہ میں سمجھا نکالا تو نے بزمِ انس سے
لے گئی دہشت امکاں کی بطرف وحشت مجھے

دل کی محویت کا وہ عالم ابھی تک یاد ہے
آپ میں آنے کی ممکن ہی نہ تھی فرصت مجھے

محو دنمائی کا عالم خود پرستی کا ہے دور
بیخودی رہتی ہے اب ایسی نہ محویت مجھے

مجھ کو منزل سے خودی کی ہے سفر تیری طرف
ہو گئی تیری جدائی عالمِ غربت مجھے

جتنا بڑھتا ہوں میں اتنا پیچھے ہٹتا جا ملک
دور کرتی رہتی ہے تجھ سے مری قربت مجھے

آسماں میں تو نہیں ہے لامکاں میں تو نہیں
تجھ کو پا سکتا نہیں میں لاکھ ہو رفعت مجھے

اک نمائش سراب ہستی کی سارا جہاں
ایک باغِ سبز سے بڑھ کر نہیں جنت مجھے

شان تیری یہ کہ بے مانگے دو عالم دے دیا
حال میرا یہ کہ اب بھی رہ گئی حسرت مجھے

۱۷۱ ——— فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ——— ۱۳

ہو گئے کیا کیا ستم اب تو نہیں کچھ یاد بھی
دل تھا پہلو میں تو کرتے تھے کبھی فریاد بھی

میں تو صید تازہ تھا چوکا مگر صیاد بھی
پلکیں ٹانکی تھیں تو سی دیتا لب فریاد بھی

تکیہ رکھتے ہیں خدا پر ہیں فقیر آزاد بھی
کم نہیں کملی سے ہم کو سایۂ شمشاد بھی

دل فریبی پر تلے ہیں سرو بھی شمشاد بھی
جاں ستانی پر کمر باندھے ہوئے صیاد بھی

میں بھی اس گلشن میں ہوں اور خانۂ صیاد بھی
نالہ وہ کھینچوں کہ جس میں برق بھی ہو باد بھی

غم نہیں اس کا اگر میں ہو گیا برباد بھی
دل تو ہے پہلو میں اور دل میں تمہاری یاد بھی

یاد ہے شیون بھی مجھ کو نالہ بھی فریاد بھی
آپ کو مرغوب کیا ہے کچھ تو ہو ارشاد بھی

اب تو قائل ہے وفا کا وہ ستم ایجاد بھی
ظلم بھی ہے رحم بھی ہے داد بھی بیداد بھی

کم نگاہی اس قدر بے التفاتی اس قدر
اک نگہ پر ہم بکے بھی ہوگئے آزاد بھی

آنکھیں پھوٹیں اوس کی جو منکر ترے جلوہ کا ہو
دیکھتا ہے یہ کرشمے کور مادر زاد بھی

رشکِ یکتائی کہاں تک تا کجا قہر و غضب
خاک میں تو مل چکے نمرود بھی شداد بھی

دیکھنا اس خوابِ نوشیں کو نہ چھیڑے ہم ذرا
شورِ ماتم بھی رہا شورِ مبارکباد بھی

کی سوادِ شہر خاموشاں نے کچھ ایسی کشش
منزلوں پیچھے رہی مجھ سے مری فریاد بھی

سایۂ گلبن میں بلبل کو اترتے دیکھ کر
چال پرچھائیں کی سی چلنے لگا صیاد بھی

دل سے بھاتی ہے وفا اہل وفا کی اسقدر
جان دے کر مول لوں دردِ سرِ فرہاد بھی

ایک تو منزل کٹھن ہے اور پتھر ہر گام پر
حادثہ پر حادثہ افتاد پر افتاد بھی

قطعہ

حشر میں ظالم نے یہ کہہ کر گلا گھونٹا مرا
ایک تو اپنا تصور اور اس پہ یہ فریاد بھی

میں تو اب چپ ہوں مگر اس خونِ ناحق کا گواہ
دامنِ جلاد بھی ہے خنجرِ فولاد بھی

لوحِ دل سے نقشِ ہستی کو مٹا کر بارہا
توڑ ڈالا ہے طلسمِ عالمِ ایجاد بھی

میرے اشک و آہ پر جو باندھنوں باندھے گئے
یوں نہ اٹھا تھا کبھی طوفانِ ابر و باد بھی

سیج پر پھولوں کی اس نے کروٹیں لیں رات بھر
گڑ گیا تھا ہار میں شاید دلِ ناشاد بھی

ناز اس بوٹا سے قد پر کیوں نہ ہو زیبا تجھے
جھومتے ہیں سرو بھی اٹھلاتی ہیں شمشاد بھی

یہ غزل خوانی نہیں اے نظم ہے صورتگری
باربد بھی محوِ حیرت ہو گیا بہزاد بھی

۱۶ ۔۔۔ ۱۶۲

چور ہوں میں جب سے جوشِ عشق میرے دل میں ہے
زور و شورِ موج کا پیدا اثر ساحل میں ہے

ابر تر ہے یا کہ ہے غمخانۂ کیف بہار
شاخِ گل ہے یا کہ پیمانۂ کفِ سائل میں ہے
تھی لہو کی چھینٹ باقی میرے جسمِ زار میں
وہ بھی کچھ تلوار میں کچھ دامنِ قاتل میں ہے
مر مٹے دریا تلک آ آ کے لاکھوں تشنہ لب
استخوانوں کی صدا خمیازۂ ساحل میں ہے
جان دینے کا مزہ اہلِ وفا سے پوچھیے
مر چکے ہیں پھر بھی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
دیدۂ بیدار میں ہے ہُو کا عالم ہر طرف
بزمِ ہستی خواب ہے اور دیدۂ غافل میں ہے
میں کسی کے منہ پہ رکھوں بات یہ عادت نہیں
ورنہ ہے میری زبان پر جو تمہارے دل میں ہے
کچھ نہ میں سمجھا کہ آخر میں ہوں تو یا تو ہی میں
کچھ نہیں کھلتا کہ دل تجھ میں ہے یا تو دل میں ہے
کشتنی سمجھے لگے بس پھیرنے گردن پہ تیغ
یہ تو پوچھا ہوتا کچھ حسرت بھی تیرے دل میں ہے
ناتواں تھا میں اٹھا سکتا نہ سختی راہ کی

بات اتنی ہے کہ دم اٹکا ہوا منزل میں ہے
اس کی چشمِ سرگیں سے ہو رہا ہے قتلِ عام
مشعلیں روشن ہیں اور اندھیرا اس محفل میں ہے
خونِ ناحق کا پتہ دیتی ہیں تیری شوخیاں
کچھ یہی انداز تو بیتابیٔ بسمل میں ہے
ناقہ ہے نخچیر مجنوں کی کمندِ آہ کا
بچ کے جا سکتی نہیں لیلیٰ اگر محمل میں ہے
کونسی جا جلوۂ جاناں نظر آتا نہیں
دل میں ہے آنکھوں میں ہے خلوت میں ہے محفل میں ہے
تیرا افسوں چل گیا عالم پہ اے زہرہ جبیں
ہند میں تو اور افسانہ ترا بابل میں ہے
کس مصور نے بنایا آنکھ کی تصویر کو
دیکھ لو سارا طلسماتِ جہاں اک تل میں ہے

١٠٣ ١٤

زندگی جن سے تھی وہ مجمع پریشاں ہو گئے
سخت جاں تھے ہم کہ پھر جینے کے ساماں ہو گئے
آ کے مقتل میں ترے کشتے سلیماں ہو گئے

تیر جو اوڑتے ہوئے آئے تھے پریاں ہوگئے

حلق سے اوتری بھی تو اوتری لہو ہوکر شراب
پھر ساقی میں مجھے دو گھونٹ چھدریاں ہوگئے

مذہبِ اہلِ وفا میں رو کے میں مجرم ہوا
اشک گر کر آنکھ سے دست و گریباں ہوگئے

کیا بتاؤں رو رہا ہوں کب سے اے اہلِ جہاں
نوح کے کتنے ہی اس عرصے میں طوفاں ہوگئے

کبر جن کا بڑھ گیا حد سے وہ ہیں تنگِ جہاں
جو کہ جامہ سے ہوئے باہر وہ عریاں ہوگئے

آنسوؤں میں ہے مرقع مجمعِ احباب کا
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہوگئے

قصرِ قیصر تک فرشتہ جا نہ سکتا تھا کبھی
کیا قضا آئی تو اندھے سب نگہباں ہوگئے

جان جائیگی نہ چھوڑیں گے در میخانہ اب
ہم سے اور پیر مغاں سے عہد و پیماں ہوگئے

رہ گئے جی کھول کر رونے کی جو ارمان تھے
چھپتے چھپتے دل میں آخر زخمِ خنداں ہوگئے

کیا سمجھ کر جان دینے کو کہا تھا آپ نے
دیکھ کر لاشہ کو کیا جلدی پشیماں ہو گئے
ڈوری جو گیسو میں گرہ آنچل سرک جانے لگا
جب لیا آنچل تو پھر گیسو پریشاں ہو گئے
مڑ کے دیکھا اوس نے دل سینوں میں بسمل کر دئے
منھ ادھر پھیرا تو جو بسمل تھے بے جاں ہو گئے

۱۴ ولہ 16

دیکھنا شورش وفورِ گریۂ سرشار کی
گرد ہوکر بیٹھی جاتی ہے گھٹا اُس پار کی
سنگِ بارانِ ستم کا ہو رہا ہے مشورہ
کرتی ہیں گردوں سے باتیں چوٹیاں کہسار کی
ہم نے وہ میدان مارا ہو کہ جس میں ہر طرف
آرزو کا خون ہے یا لاش ہے پندار کی
شش جہت ہی اک گھروندا رہ گذارِ سیل پہ
جس میں گردوں ایک چلتی چھاؤں ہے دیوار کی
سب کو قسمت نے کیا ہے لا کے اس زنداں میں قید
رہنے والی ہے اجل جس گنبدِ دوار کی

جان دے کر مر کے پہنچا ساحل مرقد پہ میں
جھیل کر آفت بھنور کی موج کی منجدھار کی
صفحۂ عالم پہ طومار شب غم ہے رقم
مہر ہے اس پر ہمارے دیدۂ بیدار کی
بند ہو کر آنکھ پھر کھلنے کی ہے کس کو امید
لوٹ لے جتنی ہے دولت دیدۂ بیدار کی
دن جو ہیں اپنے خزاں کے کچھ بھلا لگتا نہیں
یہ فضا یہ چھاؤں یہ ٹھنڈی ہوا گلزار کی
ابر کو جوش جنوں میں دیکھ کر کہتا تھا میں
اوڑ رہی ہیں دھجیاں کیا دامن کہسار کی
موج ہے آب گہر کی مسکرا دینا ترا
شعلۂ یاقوت ہے جنبش لب گفتار کی
ہاتھ میں لے آئینہ کیطرح مشتاقوں کا دل
اوس میں صورت دیکھ اپنے نخوت و پندار کی
دیکھنے کی ہیں ادائیں سیکڑوں اور اک نگاہ
لکھی ہے قسمت میں گردش مردم بیمار کی
دشت حیرت میں تھا سرگرداں کہ اٹھا گرد باد

کھل گئی مجھ پر حقیقت گنبدِ دوار کی
جلوہ اس کافر کا جب دیکھا تو رکھ دی ہاتھ سینے
مردمِ دیدہ نے سمرن آنسوؤں کے تار کی
نیم بسمل ہے نہ مرتا ہے نہ اب جیتا ہے نظم
پڑ گئی اوچھی سروہی ابروئے خمدار کی

۱۷۵ ۱۵

آ کے مجھ تک کشتیِ مے ساقیا اولٹی پھری
آج کیا ندی بہی الٹی ہوا اولٹی پھری
آتے آتے لب پر آہِ نارسا اولٹی پھری
وہ بھی میرا ہی دبانے کو گلا اولٹی پھری
مڑ کے دیکھا اوس نے اور وار ابرو کا چل گیا
اک چھری سیدھی پھری اور اک ذرا اولٹی پھری
لا سکا نظارۂ رخسار روشن کی نہ تاب
جا کے آئینہ پہ چہرہ کی ضیا اولٹی پھری
راست بازوں ہی کو پیسا آسماں نے آتدن
وائے قسمت جب پھری یہ آسیا اولٹی پھری
جو بڑا بول ایک دن بولے تھے پیش آیا وہی

گنبدِ گردوں سے ٹکرا کر صدا الٹی پھری
رزق کھا کر غیر کی قسمت کا زنبورِ عسل
تو نے دیکھا حلق تک جا کر غذا الٹی پھری
تو[1] ستائش گر ہے اوس کا جو ہے تیرا مدح خواں
یہ تو اے مشفق ضمیر[1] مرحبا اولٹی پھری
جس پر آئی تھی طبیعت کی اوسی نے کچھ نہ قدر
جنسِ دل مانندِ جنسِ ناروا اولٹی پھری
یا تو کشتی ڈوبتی تھی یا چلی ساحل سے دور
وائے ناکامی پھری بھی تو ہوا اولٹی پھری
گرنے والا ہے کسی دشمن پہ کیا تیرِ شہاب
آسماں تک جا کے کیوں آہِ رسا اولٹی پھری
جی گیا میں اوس کے آجانے سے دشمن مر گیا
دیکھ کر عیسیٰ کو بالیں پر قضا اولٹی پھری
مر گیا بے موت میں آخر اجل بھی دور سے
کوچۂ قاتل کا تبلا کر تیا اولٹی پھری

[1] یعنی مرحبا یک میں جو ضمیر ہے یا مرحبا بہ میں جو ضمیر ہو ان "ہو" ضمیروں کی جگہ ضمیر متکلم مقصود ہے یعنی مرحبا بی ۱۲

ہجر کی شب مجھ کو اولٹی سانس لیتے دیکھ کر
ایک ہی دم میں وہاں جا کر صبا اولٹی پھری
ہے مرا ویرانۂ غم نظم لہ سا ہولناک
موجِ سیل آئی تو لے کر بوریا اولٹی پھری

---

۱۷۶ ایک دم کو حسنِ گل سے گلشن آرائی ہوئی ۱۵
اک نظر اس باغ میں شبنم تماشائی ہوئی
صبحِ پیری اور غفلت اس قدر چھائی ہوئی
مسکراتی ہے سرِ بالیں اجل آئی ہوئی
خندہ زن گل۔ لب پہ غنچوں کے ہنسی آئی ہوئی
اے صبا کچھ خیر ہے چال ایسی اٹھلائی ہوئی
اک قدم ہے اندرونِ خانہ اک بیرونِ در
سانس قالب میں جو آئی بھی تو گھبرائی ہوئی
منہ سے نکلی بات اور طوفاں پہ طوفاں اٹھے
اشک ٹپکا اور رسوائی سی رسوائی ہوئی
مڑ کے میں دنیا و عقبیٰ کی طرف کیا دیکھتا
مانع وہم دو عالم تیری یکتائی ہوئی

بازآئے کب سیہ کاری سے ہم مثل قلم
مدتوں سجدے رہے برسوں جبیں سائی ہوئی

باغِ عالم میں بہار زندگانی ہو تو کیا
ایک ہی دل کی کلی اور وہ بھی مرجھائی ہوئی

کجروی طینت میں ایسی ہو تو اس کا کیا علاج
راہ تو سیدھی ہے لیکن چال کترائی ہوئی

کوئی رسوائی تلک آنے کو نہ اٹھتا تھا قدم
دستگیر آخر کمندِ ناشکیبائی ہوئی

عشق کے شعلوں کو اب تو ہی بجھا اے چشم تر
یاد کر یہ آگ ہے تیری ہی بھڑکائی ہوئی

کھل گئے گل۔ عقدۂ دل ناکشودہ ہی رہا
ناخنِ موجِ صبا سے بھی نہ گیرائی ہوئی

شام سے سوزِ شبِ غم نے مجھے دکھلا دیا
شمع کے منہ پر جو دیکھی مردنی چھائی ہوئی

گنبد اک وہ بھی ہے وہم و شک کی بازی گاہ کا
بات جو سمجھی ہوئی ہے یا ہے سمجھائی ہوئی

ہے وہی علت عدم کی جو ہے علت کا عدم

باعث ہنگامہ اپنی ناشناسائی ہوئی

۱۷۷ ۳۶

عشق میں جب تک جنوں کی کارفرمائی نہ تھی
گرمیٔ ہنگامۂ بازار رسوائی نہ تھی

شغل خود بینی تماشائے بزم آرائی نہ تھی
جلوہ گر تھا یار او چشم تماشائی نہ تھی

کیا سمجھ کر دشت میں جاتا بہار آئی نہ تھی
کس طرح میں جھوم کر اوٹھتا گھٹا چھائی نہ تھی

مجھ کو آوازِ شکستِ رنگ نے رسوا کیا
ورنہ دل کی بات تو لب تک کبھی آئی نہ تھی

جنگلوں میں خاک چھانی ہے جوانی کے لئے
منزلوں گرد رم آہوے صحرائی نہ تھی

لذتِ دنیا کے خمیازہ کو ہم زندوں سے پوچھ
دم نکلنے کی یہ تھی تصویر انگڑائی نہ تھی

تشریح: ۲۰ نے اپنی ناشناسائی ہنگامۂ ممکنات کا باعث ہوئی یعنی ہم خود کو نہ پہچان سکے سمجھے کہ ہم بھی ہیں تو ساری کائنات کا ہونا لازم ہے یہ ناشناسائی یعنی عدم ادراک ہی ادراک عدم کا باعث ہوا اس طرح ممکن کے لئے عدم ترجیح ترجیح عدم کا باعث ہے۔

ترکِ لذت میں بھی کچھ دل کو مزہ ملنے لگا
ورنہ کیا مجھکو ہولئے بادہ پیمائی نہ تھی

وصل کیا ہوتا کہ طبعِ یار بھی خلوت پسند
اور اپنے گوشۂ خاطر میں تنہائی نہ تھی

جلوۂ گُل کے بھی مشتاقوں میں ہم اک عمر تک
اور نرگس کی طرح آنکھوں میں بینائی نہ تھی

کون ہوں میں یاد ہو گا آپ کو یہ اے کلیم
برقِ ایمن سے کسی نے آنکھ جھپکائی نہ تھی

یا تو لے سکتا نہ تھا میں سانس یا تڑپا کیا
جانِ تازہ تھی یہ شاید ناشکیبائی نہ تھی

چشمِ تر دیکھنا دامن کسی نے آج تک
رہگزارِ سیل میں دیوار اٹھوائی نہ تھی

سوتے سوتے شورِ محشر جاگ اوٹھا کس طرح
اے جنوں میں نے ابھی زنجیر کھڑکائی نہ تھی

ترکِ الفت کرکے نکھرا اور بھی کافر کا رنگ
دل کو حسرت ہے کہ پہلے تو یہ رعنائی نہ تھی

دیکھنا ہے سیر اگر میرے تڑپنے کی تو دیکھ

یہ نہ کہہ بیٹھا کہ بسمل میں شکیبائی نہ تھی

ساتھ غیروں کے بھی تھے ہم بھی دور ساغر میں شریک
پی رہے تھے خون اپنا بادہ پیمائی نہ تھی

اب کہیں دل سے لگی رہتی ہے تو وہ لو نہیں کہیں
یوں کبھی رنگ حنا نے آگ بھڑکائی نہ تھی

وہ تو آنکلا تھا لیکن ہو گئی کیا جلد صبح
میں نے اب تک زلف بھی چہرہ سے سرکائی نہ تھی

بات کی تو نے تن بیمار میں جان آگئی
سچ بتا پھر یہ کیا تھا گر مسیحائی نہ تھی

آگیا کیا چین مجھ کو گر کے اس کے پاؤں پر
یہ علاج دردِ سر تھا ناصیہ سائی نہ تھی

صور اسرافیل سے بس جاگنے والا نہ تھا
کیا کہیں تو نے تو آکر قبر ٹھکرائی نہ تھی

ہم سمجھ کر تخت پریوں کا نکل جانا کہاں
اتنی بھی کو تہ کمند نا شکیبائی نہ تھی

کشتیِ مے پر ہے اب تخت سلیماں کو بھی رشک
بادہ پیمائی تھی آخر بادِ پیمائی نہ تھی

قلزم مے میں ہیں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے
آ گئی تھی لہر اک مستوں کی انگڑائی نہ تھی

زندگی گذری ہے کیونکر یہ بتانا اے اجل
لاکھ بار آئی تھی تو کچھ ایک بار آئی نہ تھی

ہم نے عالم میں کہیں وہ دل ملا دیکھے نہیں
ان میں یکرنگی نہ تھی تو ان میں یکجائی نہ تھی

فرش استبرق بچھایا تھا نگاہِ شوق نے
حشر کے دن ہم کو فکرِ برہنہ پائی نہ تھی

کیوں نکل کر تو ہوا خلوت سے زیب انجمن
حسن بے پردہ تھا جب تک تو یہ رسوائی نہ تھی

کام مشکل آ پڑا تھا اور نہ تھا عزم درست
عقدہ تھا دشوار اور ناخن میں گیرائی نہ تھی

پھیر لیتی ہے نگہ تصویر بھی اس شوخ کی
پوچھتا ہوں جب کہ ہم سے کیا شناسائی نہ تھی

مہرباں ہوتے غریبوں پر تو گھٹ جاتی نہ شان
کیا تم آجاتے تو میری قدر افزائی نہ تھی

پست ہو جانے سے اپنے ہو گیا تیرا عروج

ورنہ کچھ تیری بساطِ چرخِ مینائی نہ تھی

ہم تھے ساقی تھا، ہمارا میکدہ تھا جام تھا
جب زمانہ میں بنائے چرخِ مینائی نہ تھی

میرے لب سے ہوگیا کیسا گُلِ رخسار سُرخ
تیرے لب سے برگِ گل اس طرح شرمائی بھی

راہ میں شل ہوگیا برہان و حجت کا قدم
پیروی عقل نادانی تھی دانائی نہ تھی

پوچھتا ہے نظم مجھ کو نرگسِ بیمار سے
کیوں چلی آئی چمن میں گر توانائی نہ تھی

۱۷۸ ۱۱

شرم یہ کیوں یہ تبسم ہائے پنہاں کس لئے
سر پہ آنچل کس لئے منہ پر ہے داماں کس لئے

غور کر طرزِ جفا کو دیکھ اندازِ وفا
تیغ گریاں کس لئے ہے زخم خنداں کس لئے

کھول کر بندِ کفن پوچھے کوئی احباب سے
منہ چھپا کر جاتے ہیں اس گھر سے مہماں کس لئے

سر بزانوئے توکل تن بہ آغوشِ رضا

ذکر سر کس واسطے ہے فکر ساماں کس لئے
صحبت بے مغز گرانبار ساماں ہوتی نہیں
درد سر رکھتا ہے پھر شیر نیستاں کس لئے
سن کے حرف آرزو جامہ سے کیوں باہر ہوئے
خیر ہے کچھ ہو گئے شمشیر عریاں کس لئے
منھ سے تو نے کہہ دیا جو آ گیا مجھ کو یقیں
جستجوئے قسمیں کس لئے ہیں عہد و پیماں کس لئے
ہو کے تائب شیخ سے بیعت بھی کر کے دیکھ لی
جا کے اب باندھوں نہ پیمانے سے پیماں کس لئے
اک نگاہ لطف ہو اوس کی تو یہ سب ہیں نثار
جان و دل کس واسطے ہیں دین و ایماں کس لئے
خضر بھی ہیں غرق گرداب اجل میں ایکدن
اے سکندر ہے تلاش آب حیواں کس لئے
کس بہار حسن سے اے نظم تھا تو ہمکنار
چاک ہیں گل کی طرح جیب و گریباں کس لئے

۶ ۱۷۹

مے پلا ساقی ارے فصل بہار ایسے میں ہے

آبِ حیواں دے حیاتِ مستعار ایسے میں ہے
سچ ہے اے ناصح کہ یہ ہنگامِ مے نوشی نہیں
مجھ کو جلدی ہے کہ دستِ اختیار ایسے میں ہے
پھر نہ یہ سمرن ملے گی یادِ حق کے واسطے
آنسوؤں کا پنجۂ مژگاں میں تار ایسے میں ہے
وقت ہے ہمیدِ رمیدہ جاکے آنیکا نہیں
وار کرنا ہو تو گرز و پرشکا ایسے میں ہے
بعد اس کے پھر گلے سے بھی ملا قاتل تو کیا
پھیر دے آکر چھری دل بے قرار ایسے میں ہے
دیکھ تو حیدر کوئی تیرا ابھی ہے پرسانِ حال
چند ساعت اور ابھی روزِ شمار ایسے میں ہے

۱۸ ۱۸۰

سنگ پانی ہونے کو بانی ہوا ہونے کو ہے
دیکھ اے منکر ابھی دنیا فنا ہونے کو ہے
پرسشِ اہلِ گنہ روزِ جزا ہونے کو ہے
گرمیِ بازارِ جنسِ ناروا ہونے کو ہے
اپنی بے صبری سے عکسِ مدعا ہونیکو ہے

آئینہ دار اثر دست دعا ہونیکو ہے
دل وہی دل ہے جو اس کا مبتلا ہونیکو ہے
جان ہے وہ جان جو اس پر فدا ہونیکو ہے
ایڑیوں تک دوش سے گیسو رسا ہونیکو ہے
پڑھتے ہی پڑھتے یہ افعی اژدہا ہونیکو ہے
قتل سے میرے پشیماں بے وفا ہونیکو ہے
اک ستم تو ہو چکا اب دوسرا ہونیکو ہے
گو سراپا شعلۂ اخگر ہوں پر کچھ غم نہیں
خاک ہو جانا مرا عقدہ کشا ہونیکو ہے
بزم میں ساغر کسی کے واسطے کوئی بھرے
میں سمجھتا ہوں کہ میری ہی صلا ہونیکو ہے
شان اُس کی دیکھ کر سمجھے تھے ہم روز الست
دولت کونین بے مانگے عطا ہونیکو ہے
کس طرح بازو پہ میرے ہو دعائے چشم زخم
اوس کی سنا کی پہ شور مرحبا ہونیکو ہے
ہاتھ سے آئینہ جب رکھا تھا سمجھا تھا یہ میں
ہو چکا ہے تیز خنجر اب جفا ہونیکو ہے

سلسلہ جنبانِ وحشت ہے خیالِ خالِ رخ
دانہ زنجیر کو نشو و نما ہونے کو ہے

یاس میں مجھ کو تسلی دے رہی ہے بیخودی
پردہ اب اوٹھنے کو ہے اب آشنا ہونیکو ہے

چپکے چپکے ظلم کرنا چھپ نہیں سکنے کا اب
ناوکِ بیداد میں پیدا صدا ہونیکو ہے

فکرِ بے جا ہے منغص کیجیے کیوں عیش کو
یہ تو ہے معلوم قسمت کا لکھا ہونیکو ہے

چل کے زندان و گریباں کے ستم کی داد دو
مژدہ اے اہل جنوں محشر بپا ہونیکو ہے

آگیا ہے شرم عصیاں سے جو آنسو آنکھ میں
یہ کے رخساروں پہ دُرِّ بے بہا ہونیکو ہے

یہ نگارستانِ ہستی مظہرِ قدرت سہی
نقش ہو گر آبِ حیواں پر فنا ہونے کو ہے

۱۵ ولہ ۱۸۱

لہریں دریائے ہستی کی حباب آنیکو ہے
جو کوئی آنیکو ہے پا در رکاب آنیکو ہے

حسن کی آئینہ داری کو شباب آنیکو ہے
زلف میں بل گیسوؤں میں پیچ و تاب آنیکو ہے

مژدہ اے دل پھر ہوائے انقلاب آنیکو ہے
دور گردوں ہو چکا دورِ شراب آنیکو ہے

آنکھ میں تیری مروّت بھول کر آتی نہیں
شرم سو سو بار آنے کو حجاب آنیکو ہے

کہہ دیا بس۔ فال بد منہ سے نہ او واعظ نکال
مجھ پہ رحمت آوے گی تجھ پر عذاب آنیکو ہے

جا چکی تاب و تواں بس اب ہے اتنا انتظار
زندگانی کیطرف سے بھی جواب آنیکو ہے

پتلیاں پتھرا چلی ہیں کہتے کرتے انتظار
چارہ گر خوش ہیں کہ اب آنکھوں میں خواب آنیکو ہے

دیکھیے کیا رنگ ہو محفل کا اہلِ مصر کی
ہاتھ میں چھریاں ہیں یوسف بے نقاب آنیکو ہے

ہجر کی اک شب میں گھڑیاں بج چکی ہیں دو ہزار
اے فلک سمجھوں گا میں روزِ حساب آنیکو ہے

سونے والو وقت آخر ہو گیا اب تو اٹھو

لے کے آئینہ لبِ بام آفتاب آنیکو ہے

شیشۂ توبہ نہ جوشِ کشمکش میں ٹوٹ جائے
جھوم کر صحنِ گلستاں میں سحاب آنیکو ہے

آگئی عارض پہ سرخی ہر طرح سے ہے ستم
یا حجاب آنیکو ہے یا اب عتاب آنیکو ہے

خانۂ دل سے اوٹھائیں اپنا بستر صبر و ہوش
اس سرا میں کاروانِ اضطراب آنیکو ہے

جوشِ گل کی کشمکش میں آگیا سبزہ کو غش
شیشۂ شبنم میں کھنچ کھنچ کر گلاب آنیکو ہے

نظمؔ دیکھیں مصطفیٰ کا جانشیں ہوتا ہے کون
عرش سے مسجد میں حکم سدِ باب آنیکو ہے

١٨٢ — وله — ١٦

جشنِ جم کا ماجرا بادِ صبا سے پوچھ لے
کیا ہوا تختِ سلیمانی ہوا سے پوچھ لے

داورِ حشر آرزوؤں کا نکلنا تو کجا
جان بھی مشکل سے نکلی ہے قضا سے پوچھ لے

کشتۂ تیغِ تغافل کی نہیں تجھ کو خبر

میں بتاؤں تجھ کو تو اپنی ادا سے پوچھ لے

پوچھنا کیا ہے کسی سے دل کو دل کی ہے خبر
سارا ماجرا اس ساغر گیتی نما سے پوچھ لے

دو گواہوں سے پریشانی کا میری ہے ثبوت
گر تجھے باور نہیں زلف دوتا سے پوچھ لے

ہر قدم پر آتی ہے شہر خموشاں سے صدا
خاک میں ہم مل گئے ہیں نقش پا سے پوچھ لے

اے جنوں لے چل کسی جنگل میں ہے جوش بہار
راہ جنگل بن کے اس کالی گھٹا سے پوچھ لے

آ گیا آتش قدم کہنے پہ تنہا اس قدر
جھوٹ کیا ہے شعلۂ رنگ حنا سے پوچھ لے

لوٹنا بھی دل کا ظالم دیکھنے کی سیر ہے
آنکھ اوٹھانے کے لئے شرم و حیا سے پوچھ لے

زال دنیا کے فریب و مکر سے غافل ہے تو
بے وفائی اس کی مردان خدا سے پوچھ لے

جوش مستی میں نہ آنا بے محابانہ گذر
راہ میں آنکھیں بچھی ہیں نقش پا سے پوچھ لے

ہے زبانِ شمع خاموشی میں بھی صرفِ سخن
بزمِ ہستی کی خبر اہلِ فنا سے پوچھ لے
معنی کا پیکر ہو گر پہنا پڑے مثلِ ضمیر
دور کیوں جا تو خبر کو مبتدا سے پوچھ لے
منفعل ہو تو نہیں ہے اس کی رحمت میں کمی
چشمِ تر سے پوچھ لے دستِ دعا سے پوچھ لے
جس ہنر سے خود ہو عاری سیکھ لے اوستاد سے
راستہ جو بھول جائے رہنما سے پوچھ لے
پھر شکیبائی کا دعویٰ ہو چلا ہے نظمؔ کو
پھر مزاج آ کر ذرا ناز و ادا سے پوچھ لے

۶ ۱۸۳

منزلوں کو عشق کی اہلِ جنوں سے پوچھیے
حال یہ یارانِ نجد و بے ستوں سے پوچھیے
دل کے خوں ہونے کی حالت اشکوں سے پوچھیے
جان پر کیا بن گیا سوزِ دروں سے پوچھیے
آسماں سے کیجیے باتیں ذرا تن کر غضب
وجہ بربادی کی کچھ گردونِ دوں سے پوچھیے

سن سکیں گے آپ کیونکر دل کی بیتابی کا حال
پوچھیے لیکن ذرا صبر و سکوں سے پوچھیے

سرکشی کا دیکھیے سرو و صنوبر کی ثمر
جھومنے کی وجہ شاخِ سرنگوں سے پوچھیے

دہر ہے مانندِ قلزم آسمان مثلِ حباب
تھاہ کو پھر اس کی کیا گردونِ دوں سے پوچھیے

تا بلب آتا ہے نالہ کروٹیں لیتا ہوا
وجہ بیتابی کی لذتِ ارغنوں سے پوچھیے

۱۴ ولہ ۱۴۴

عشق خطا سو ہے سو الفت لبِ خاموش کی
بڑھتی ہی رہتی ہے گرمی آتشِ خس پوش کی

ہم نے اس ساماں سے لی کوچۂ قاتل کی راہ
بارِ گردن سر کیا گردن وبال دوش کی

کاسۂ سر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھے وہیں
ہر قدم پر جس جگہ محفل تھی نا و نوش کی

خاکدانِ دہر کے چھٹنے کی پروا کچھ نہیں
تیرا دیوانہ یہ سمجھا گرد تھی پاپوش کی

قبر پہ آیا بھی تو شوخی سے باز آیا نہ وہ
شمع مدفن گاہ روشن کی کبھی خاموش کی

دیکھ کر پھولوں پہ شبنم ہے یہ مستوں کو گماں
رال ساغر پہ ٹپکتی ہے کسی مے نوش کی

کیا کمندِ زلف کم تھی قتلِ عالم کے لئے
اوس پہ یہ طرہ ہوا الٹوا زیبِ دوش کی

رنج دینا اس قدر مجھ سے رہا دست و بغل
وسعتِ عالم ہوئی تنگی مری آغوش کی

ہٹ نہ جائے آسماں اک دن گہردندی کی طرح
اشکِ غم میں شوخیاں ہیں طفلِ بازی گوش کی

احتمال اب تو مکاں کا لامکاں پر ہو گیا
بڑھ گئی ہے اس قدر پرواز میرے ہوش کی

جاتے ہی منبر پہ واعظ آپ سے باہر نہ ہو
الحذر اے مہرباں کچھ حد بھی ہے اس جوش کی

نشا ساغر دور سے ساغر کے نکلے کس طرح
یہ نگاہ مست ہے ساقی کسی مے نوش کی

ہے بجائے خود کمالِ شوق بھی مشکل

تنگ آنا یار کا تنگی ہوئی آغوش کی
آرزوئے دل کو سن کر یہ فرماتے ہیں وہ
جی میں کیا اے نظم ہے باتیں کرو کچھ ہوش کی

۱۸۵ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱۴

کیا کہیں کیونکر تھمے کیونکر چلے
مضطرب آئے یہاں مضطر چلے

غیر کے گھر اس طرف ہو کر چلے
مفت کا احسان مجھ پر دھر چلے

ضعف میں بھی ہو گئی طے راہ شوق
ہر جگہ گر گر اٹھے اوٹھ کر چلے

کیا نگاہ آفت تھی کیا عشوہ تھا فتنہ
بزم میں چھریاں چلیں خنجر چلے

زیر گردوں زندگانی تھی پہاڑ
آفتیں جھیلیں مصیبت بھر چلے

ہو تواضع بھی مگر تمکیں کے ساتھ
چاہیے جھک کر نہ رک رک کر چلے

سندس و قاقم کی بھی پروا نہ کر
جب تک اپنا گیر و التیر چلے

کیا مزاج دہر کی اصلاح ہو
چار دن ایسی ہی ہم بھی کر چلے

اس کو پھر تیغ آزمائی کا ہے شوق
کیا ہوا اگر زخم میرے بھر چلے

ساقیا ہم سب ہیں رند پاکباز
جادۂ تسلیم پہ سا نمر چلے

خاک ہو جاؤں تو پہنچوں اوڑ کے کاش
کچھ تو میرا زور گردوں پر چلے

قبر میں گھٹ گھٹ کے یوں رہ جائیں ہم
ہائے یہ ٹھنڈی ہوا باہر چلے

وہ تو دل لیتے ہی بازی لے گیا
داؤ اپنا دیکھیے کیونکر چلے

کشتی مے لے کے ساقی جلد آ	جھومتے دریا پہ ابر تر چلے
۱۸۶	۲۱
تندی مے حیرت افزا ہو گئی	موج برق طور سینا ہو گئی
جب زبان حال گویا ہو گئی	بات خاموشی میں پیدا ہو گئی
دل میں اٹھی تھی ابھی اک لہر سی	آنکھ تک پہنچی تو دریا ہو گئی
عیش کی رات اس قدر کوتاہ تھی	شام امشب صبح فردا ہو گئی
دب گیا گرد کدورت میں جو دل	دفن ساتھ اس کے تمنا ہو گئی
آتی ہے تار نفس سے یہ صدا	روح مرغ رشتہ بر پا ہو گئی
ضبط گریہ تجھ کو راس آتا نہیں	پھر کھٹک آنکھ دل بینا ہو گئی
دل میں چپکے سے برا آیا خیال	اور خبر عالم میں افشا ہو گئی
پھر تجھے انساں کو نظر آتا نہیں	آنکھ جب محو تماشا ہو گئی
ہاتھ رکھتے ہی دل بیمار پر	مضطرب نبض مسیحا ہو گئی
کچھ نشاں تجھ کو ملا اے خاک جم	تیری دولت کس نے لی کیا ہو گئی
پیر زن کے کلبۂ تاریک سے	روشنی طاق کسریٰ ہو گئی
چشم موسیٰ کو تھا ایسا شوق دید	اک نگہ برق تجلی ہو گئی
عشق کے اس شعبدہ کو دیکھنا	پھر جوان کیونکر زلیخا ہو گئی
دست و پا ارے کسی نے اب تو کیا	سر سے اونچی موج دریا ہو گئی

آ گیا گلشن میں فرمانِ بہار — زلفِ سنبل خطِ طغرا ہو گئی
عشق بھی اک قوتِ اشرف ہے — دل سے دل میں راہ پیدا ہو گئی
وار پر کھینچو سزا اس کی یہ ہے — کیوں طبیعت ناشکیبا ہو گئی
دل میں تو نے جو چھپا رکھی ہے بات — وہ بھی چتون سے ہویدا ہو گئی
ہو گئی نانِ جویں سدِّ رمق — لیجئے آباد دنیا ہو گئی

نظم کھینچا تو نے دنیا سے جو ہاتھ
دیکھ ہر نعمت مہیا ہو گئی

۱۸۷ — ولہ — ۱۳

سجدے زنار کیوں کیسی کہی — زاہدِ عیار کیوں کیسی کہی
کٹ گئے اغیار کیوں کیسی کہی — چھا گئی ہر بار کیوں کیسی کہی
ہیں یہ سب اقرار جھوٹے یا نہیں — کیجئے اقرار کیوں کیسی کہی
روٹھنے سے آپ کا مطلب یہ ہے — اس کو آنے پیار کیوں کیسی کہی
کہہ دیا میں نے ترے جھوٹ موٹ — ہو گئے بیدار کیوں کیسی کہی
ایک تو کہتے ہیں منہ پھبتیاں — اور پھر اصرار کیوں کیسی کہی
ناصحا یہ بحث دیوانوں کے ساتھ — عقل کی ہے مار کیوں کیسی کہی
یا خفا تھے یا ذرا سی بات پر — ہو گئی بوچھار کیوں کیسی کہی
مجھ سے بیعت کرنے تو بھی واعظا — ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

سرمہ دے کر دل کے لینے کا ہی قصد — آنکھ تو کر چار کیوں کیسی کہی

جان دیدے چل کے در پر یار کے — او دل بیمار کیوں کیسی کہی

کیا ہی جھگڑے ہو چکے کی بات پر — ہو گئے بیزار کیوں کیسی کہی

اب تو حیدر اور ہی کچھ رنگ ہیں
مانتا ہوں یار کیوں کیسی کہی

١٨٨ —— فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات —— ١٧

ہیچ نظروں میں اگر عالم فانی ہو جائے — پھر یہی ہیچ مدانی ہمہ دانی ہو جائے

کشتی بادہ میں پیدا وہ روانی ہو جائے — رنگ نجم فلک آبی کبھی دھانی ہو جائے

کاش دل کش مری آشفتہ بیانی ہو جائے — درد دل تو نہ مرا اس کی کہانی ہو جائے

دل اگر رہرو اقلیم معانی ہو جائے — مرتفع بعد مکانی و زمانی ہو جائے

خسرو عشق نے تیشہ کو وہ عزت دی ہے — سر فرہاد پہ جو تاج کیانی ہو جائے

جوش میں آئے اگر دل جو ہے اک قطرۂ خوں — گرم ہنگامۂ خونابہ فشانی ہو جائے

جائے عبرت ہے کہ یوں کوچ کرے لشکر گل — جرس قافلہ اک برگ خزانی ہو جائے

اک ذرا تشنگی شوق میں تاثیر ہے شرط — پھر جو شمشیر کی طرف دیکھیے پانی ہو جائے

کبھی مرنے کا ہی مذکور کبھی حشر کا ذکر — پاس و اغلاط کے جو سمجھے خفقانی ہو جائے

دہن زخم سے سنتوں کے نکلتی ہے دعا — کہ زیادہ ترے خنجر کی روانی ہو جائے

شکوہ ہجر جو کرتا ہوں تو ملتا ہے جواب — صبح ہو جلد نہیں ختم کہانی ہو جائے

کس قدر جوش ہے واعظ کہیں ایسا تو نہ ہو — صرف رندوں ہی پہ زورِ ہمہ دانی ہو جائے
گو ہر چند کجا اور کجا ناشنوا — دیکھ پتھر نہ سماعت کی گرانی ہو جائے
رشتہ در رشتہ جو ہے طولِ امل لطف تو جب — صید اس دام میں طاؤسِ جوانی ہو جائے
چمنستاں میں عنادل کا ہوا ایسا تو ہجوم — شاخِ گل جو ہو وہ ارگن کی کمانی ہو جائے
ہاتھ میں لے کے عصا طور پہ آئے ہیں کلیم — آشکارا نہ کہیں حالِ شبانی ہو جائے

راہِ مولیٰ میں اگر نظم کو آجائے اجل
گردِ صحرائے نجف بردِ یمانی ہو جائے

۱۸۹ — ۱۲

وہ جو برہم ہیں تو بگڑی ہوئی تدبیر بھی ہے — مستعد لڑنے پہ مجھ سے مری تقدیر بھی ہے
دیکھیں اب ملتی ہے کیا داد ہمیں محشر میں — دل بھی قاتل بھی ہے پیکاں بھی ہے تیر بھی ہے
چاہے وہ قتل کرے چاہے مجھے قید کرے — سر بھی شمشیر بھی ہے پاؤں بھی زنجیر بھی ہے
منہ سے شکوہ تو میں کرتا نہیں خود دیکھ لیں آپ — دل میں اک زخم بھی ہے زخم میں اک تیر بھی ہے
دلِ مضطر کی اسیری کے ہیں ساماں کیا کیا — زلف و کاکل بھی ہے گیسوئے گرہ گیر بھی ہے
خونِ ناحق کو بھلا حشر میں مکرے تو سہی — تیغ و صیاد بھی فتراک بھی نخچیر بھی ہے
کس کو دیتا ہے خدا فتح و ظفر کس کو شکست — دیکھنا بختِ جواں بھی فلکِ پیر بھی ہے
ہم نے ان زہد فروشوں کو بہت دیکھا ہے — کچھ حقیقت بھی ہے کچھ حیلہ و تزویر بھی ہے
لے چکے جان اشارے مژہ و ابرو کے — کشتۂ تیغ بھی ہے دل ہدفِ تیر بھی ہے

آئینہ رکھ کے ہی منظور اسے آرائش بھی ہے
اسی پردہ میں مگر قتل کی تدبیر بھی ہے

نہیں کھلتا سببِ غفلتِ اہلِ عالم
نہیں معلوم کچھ اس خواب کی تعبیر بھی ہے

چاہ کر تم کو گنہگار ہوا نظمِ حزیں
قابلِ قتل بھی ہے لائقِ تعزیر بھی ہے

۱۹۰ —— ۱۶

لے کے ساغر سروپا کا نہ رہا ہوش مجھے
کر دیا فکرِ دو عالم سے سبکدوش مجھے

ہو گیا دام کا خطرہ بھی فراموش مجھے
طبعِ رنگیں نے نہ رہنے دیا خاموش مجھے

میں نے کہتے ہوئے کعبہ کو سنا ہے اکثر
کر دیا داغِ غمِ عالم نے سیہ پوش مجھے

بزمِ عشرت میں جو آجائے وہ ہے ساقی
میں سنبھالوں اسے اتنا تو رہے ہوش مجھے

کہہ رہا ہے یہی نقشِ خطِ پیمانۂ جم
پی گئے گھول کے رندان قدح نوش مجھے

کھول کر میں گرہ زلف پشیمان ہوا
نظر آیا وہ ستمگار زرہ پوش مجھے

عہدِ پیری میں ہوا ہوں وہ شمعِ مزارِ حسرت
کہ نسیمِ سحری کر گئی خاموش مجھے

دیدہ تا دل ہے پھر آج کہ حیرانی
ہائے اے پیرِ مغاں آ گیا پھر ہوش مجھے

ہو جو ممکن تو رگِ جاں میں گرہ دے رکھو
کہ تری یاد نہ ہو جائے فراموش مجھے

عیش کی عمر ہے کوتاہ نہیں شک اس میں
شبِ گیسو میں ہوئی صبحِ بناگوش مجھے

خوف یہ ہے کہ نہیں دورِ اجل کا چل جائے
جھریاں کہتی ہیں پیری میں زرہ پوش مجھے

الفتِ مادری آخر تھی زمیں کو مجھ سے
کس محبت سے لیا کھول کے آغوش مجھے

اس کی رحمت کے میں صدقے کہ دیا زاہد کو — دل افسردہ تجھے خاطر پرجوش مجھے
بادشاہی بھی گدائی در میخانہ کی — کہ سلیماں کی طرح لیکے اوڑا ہوش مجھے
نقش حسرت ہوں کسی نے نہ کیا پیش چشم — حرف عبرت ہوں بنایا نہ در گوش مجھے

پرسش حشر سے اے نظم بچا لے گی ضرور
اوس کی درگاہ عطا پاش خطا پوش مجھے

۱۹۱ — ۱۵

دیکھے وہ زلف کہ یا قد رعنا دیکھے — جس کے آگے تو خراماں ہو وہ کیا کیا دیکھے
کس کو وہ دیکھے ترا جو رخ زیبا دیکھے — چاند یہ دیکھ کے پھر منہ نہ کسی کا دیکھے
کوئی کب تک دل ناداں تماشا دیکھے — روٹھ جانا ترا دیکھے کہ مچلنا دیکھے
خیر ناصح ہی اگر سحر بیاں ہونے دو — میں سمجھنے کا نہیں وہ مجھے سمجھا دیکھے
شکوہ ظالم کا زباں سے تو نہیں کرنے کا — میں دکھاؤں جو کوئی میرا کلیجا دیکھے
دور سے جو رہی ساغر بکف و عشوہ نما — آنکھ جس نے تری دیکھی ہو ادھر کیا دیکھے
میری بیتابی دل کی ہو اونہیں کیا پروا — جن نگاہوں نے وہ عالم تہ و بالا دیکھے
شام ہی سے غم فرقت میں ہے مرنا جو نصیب — کیوں جئے اتنا جو طول شب یلدا دیکھے
تھا کرشمہ یہ شب عیش کی کوتاہی کا — صبح اور شام کو یوں کوئی یکجا دیکھے
بدمزاجی کی بھی کچھ حد ہے الٰہی توبہ — چھیڑ دے کوئی ذرا اور تماشا دیکھے
زاہد خشک کو دعوی ہے شکیبائی کا — سامنے اس بت کافر کے ذرا آ دیکھے

جس کو منظور رسائی ہو ترے کوچہ تک
کچھ دنوں کھائے ہوا دشت کی صحرا دیکھے

ہو جسے مثل حباب ایک نگہ کی فرصت
کھول کر آنکھ کو جاتی ہوئی دنیا دیکھے

چاہیے دہر میں وہ عاقبت اندیش نظر
جو کہ امروز کو آبستنِ فردا دیکھے

جوش گریہ ہے علاج غم دیوانۂ عشق
دل سنبھل جائے جو بہتا ہوا دریا دیکھے

۱۹۲ ——— وله ——— ۲۱

جلوہ کن عکسوں سے ترے فرمانے سے
کیا کمی ہو گئی تمنا مری بر لانے سے

سرکشی نفس کی ہے باعث بیتابی دل
لہر پیدا یہ ہوئی سانپ کے بل کھانے سے

آنکھ تھی محو تماشا کہ گری اک بجلی
برق پیدا یہ ہوئی دل کے تڑپ جانے سے

عقدۂ سر حقیقت نہ ہوا حل اب تک
گتھیاں اور بھی پڑ گئیں سلجھانے سے

قید ہستی گرہ سلسلۂ تار نفس
زندگی ہوتی ہے زنجیر کے کھڑکانے سے

رو لے جی بھر کے پہاڑوں سے نکل کر ناداں
فائدہ کیا سر شوریدہ کے ٹکرانے سے

تو نے دوزخ میں گرایا مجھے اے نفس بول
شعلے اوٹھنے لگے آخر ترے بھڑکانے سے

دیکھ کر جلوۂ جاناں میں ہوا گم ایسا
آپ کو پا نہ سکا آپ میں پھر آنے سے

چشم بینا کو نظر آتے ہیں اسرار نہاں
پردۂ ابر میں بجلی کے چمک جانے سے

سارا عالم مری نظروں میں ہے خورشید نما
ذروں میں مہر کی تصویر اتر آنے سے

دیکھ اک کوٹھری کاجل کی ہے بنائے دنیا
لے نجات ابدی بچ کے نکل جانے سے

زیست کا لطف گیا ساتھ دل زندہ کے
جل گیا نخل بھی اس پھول کے کمھلانے سے

دے چکا بندے کو اذنِ دو جہاں وہ پہلے
اصل قیمت کو سمجھ لیجئے بہکانے سے

اپنی دنیا تو بنا لی تھی ریاکاروں نے
مل گیا خلد بھی اللہ کو بہلانے سے

داورِ حشر گنہگاروں سے پرسش کیسی
فائدہ قصۂ پارینہ کے دہرانے سے

اُس طرف عرش کے ہے منزلِ مقصود اپنی
رہ گیا میں کششِ ارض میں آجانے سے

دیکھ لی دیکھ لی نیت تری ہم نے ساقی
بادہ کم ہو تو بنا کچھ جام کے چھلکانے سے

آکے تو بیٹھ یہاں کام نہیں ناصح کا
میں سمجھ جاؤں گا سب کچھ ترے سمجھانے سے

کرسئ عدل کی اصغر نے بڑھا دی توقیر
داوری گاہ عدالت میں جگہ پانے سے

اوجِ مجلس اعلیٰ کی سفارش سے ملا
اور سلطانِ حق آگاہ کے فرمانے سے

داد لیتا ہوں مرے نظم نوا سنجی کی
ابر کے جھومنے سے بحر کے لہرانے سے

۱۹۳

دو تھے ہم کو بہت ذکر پریشانوں کے
سننے والے نہ رہے اب تو ان افسانوں کے

مسکرانے سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کے
بزم میں کھلنے لگے پھول بھی گلدانوں کے

گرد میں قافلۂ نکہتِ گل کی سمجھا
دیکھ کر رنگ مدہ کو گلستانوں کے

آتش افروز ہوئی برق حسد اے مطرب
نغمے نہیں شعلے ہیں ترے تانوں کے

بارِ خاطر تو نہ ہو جا کہیں اے طولِ امل
بس نباہوں میں کہیں تجھ سے ارمانوں کے

پتلیوں کا یہ تماشا تھا جو دیکھا ہم نے
ہاتھ پڑتے ہی رہے سلسلہ جنبانوں کے

شدتِ نغمہ سے ہوتی نہیں زحمت محسوس
ناقہ چلتا ہے ترنم پہ حدی خوانوں کے

بسملوں کو بھی تڑپتے نہیں دیکھا ایسا
چاندنی شمع کی مقتل میں ہے پروانوں کے

لے چل اے جذبۂ دل آنکھ بچا کر مجھ کو
پہرے بیٹھے ہوئے رہ جائیں نگہبانوں کے

ڈال دی بار پہ دردنے اون پر بھی کمند
کنگرے عرش سے اونچے تھے جن ایوانوں کے

ہیں حوادث بھی زمانہ کے وہ اعجاز رقم
نقش رہ جاتے ہیں ہر نخل میں طوفانوں کے

نخل آشوب سے اس ہفت فلک کے بچ کر
کچھ بگولے ہیں سرِ راہ بیابانوں کے

آزمانے کو جو ابنائے زمانہ کی چلا
دیو بھی مجھ کو ملے بھیس میں انسانوں کے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اربابِ کمال
حوصلے اور بڑھے جاتے ہیں نادانوں کے

خوانِ نعمت پہ ہجوم اہل ہوس کا ہے عبث
من و سلویٰ نہیں حصہ میں مگس رانوں کے

بحر موجوں سے گلا اپنا چھڑا کر نکلا
رہ گئے دام جو بچھے تھے گریبانوں کے

جلد اے بادِ مراد آ کہ ہے کشتی اپنی
منہ میں گرداب کے آشوب میں طوفانوں کے

کتنے معمورۂ عالم تھے کہ اب ان کی جگہ
خاک ہی خاک ہے دامن میں بیابانوں کے

اوس کی محفل میں خبر کچھ دلِ مضطر کی نہیں
لوٹتے ساتھ ابھی دیکھا تھا پروانوں کے

مجھ کو حیرت ہے کہ رخسار تو لو دیتے ہیں
اور کھلاتے نہیں پھول کبھی کانوں کے

ہم نے بھی گوشۂ عزلت میں کئے ہیں وہ کام
کارنامے جو تہمتن کے ہیں میدانوں کے

ایسے دروازہ کو بس دور ہی سے اپنا سلام
جس جگہ ناز اٹھانے پڑیں دربانوں کے

ہیبتِ معدلتِ دولتِ عثمانی نے
شیر میں لرزہ بر اندام نیستانوں کے

چاہیے عرشؔ کے مضمون غزل میں نظم
ساتھ ہی اس کے مضامین پریشانوں کے

۱۹۴

مجھ کو اے یار ذرا چشم نمائی ہوتی
دل تو مل جاتا جو آنکھ نہیں لڑائی ہوتی

وے کے مے پیر مغاں نے مجھے روکا ورنہ
داو پر دولت کونین لگائی ہوتی

راز ہے دل کے نہ کرتا جو زباں کو آگاہ
بات جو اپنی تھی کاہکو پرائی ہوتی

دل سے حسرت کا نکلنا تھا اگر ناممکن
ساتھ لیتی ہوئی دل کو نکل آئی ہوتی

سامنے داور محشر کے کہتے پھر آپ
پہلے مجھ سے تو ذرا آنکھ ملائی ہوتی

ضبط بیتابی دل نے جو بنایا تھا حصار
ایک آنسو نے وہ دیوار گرائی ہوتی

ہوتیر رشک میں جسطرح قفس میں بلبل
یہیں رہ جاتا اثر گر جو رہائی ہوتی

کوئی تدبیر جو بنتی تو بگڑ بیٹھتے وہ
کبھی تقدیر جو لڑتی تو لڑائی ہوتی

ٹوٹ جاتی جو یہ زنجیر تو اے دشت جنوں
شہر سے وادی وحشت میں کٹائی ہوتی

توبہ جب کرچکے ہم ابر آیا بھی تو کیا
لطف جب تھا کہ گھٹا آنکھوں میں چھائی ہوتی

وضع ہم خانہ بدوشوں کی بنا کر اے خضر
چھاونی عالم فانی میں چھائی ہوتی

روح غربت نہ اٹھاتی نہ اگر حرص مجھے
آسماں کو ہوس ناصیہ سائی ہوتی

رشک سے رک نہ سکا خیر ہوئی یہ ورنہ
اس پتنگے نے ابھی آگ لگائی ہوتی

دل کے ارمان اگر تجھ سے نہ نکلنے والے
دم نکلنے کی تو امید برآئی ہوتی

حسن جو ہوتا ہے بندش میں وہ مضموں ہیں کہاں
بڑھ کے سونے سے ہو قیمت میں گھڑائی ہوتی

کاغذ باد رہا دست ہوس میں دل زار
ارا ہو جاتا یہ ممکن جو چھڑا لی ہوتی

گر پڑا پاؤں پہ کوئی تو کہا ٹھکرا کر
لوگ بیٹھے تھے ذرا شرم تو آئی ہوتی

تو نے احسان جو اٹھایا تھا کسی کا اے نظم
آنکھ پھر سامنے اوس کے نہ اوٹھائی ہوتی

١٩٥ ولہ ١٢

جان جاتی رہے شکوہ نہیں کرنے والے
کیا جگر رکھتے ہیں دم عشق کا بھرنے والے

پھیر تو لی ہے نگہ اس کی خبر ہے کہ نہیں
مل گئے خاک میں نظروں سے اترنے والے

مضطرب ہو نہ شب غم میں ستاروں تو وہ
لیسے خاموش گذرتی ہیں گذرنے والے

روح پھونکیں تن بیجاں میں کچھ آساں نہیں
کیا مسیحا بھی ہیں دم عشق کا بھرنے والے

کوئی موسیٰ کی طرح طالب دیدار تو ہو
اپنے عاشق سے وہ پردہ نہیں کرنے والے

آفتوں کا ہے یہ گھر دم بھی نہ لینے کو ٹھہر
اتنا وقفہ بھی مناسب نہیں مرنے والے

ایسے بیزار گئے لوگ جو دنیا سے گئے
اب ادھر بھول کے بھی رخ نہیں کرنے والے

نصرت حق جنہیں موسیٰ کی طرح ہے منظور
کسی فرعون سے ہرگز نہیں ڈرنے والے

طالب منزل مقصد ہو مرا شتر عبا
ساتھ لے لے مجھے رستہ سے گذرنے والے

موج خیز غم الفت کا تلاطم تو یہ
غوطے کھا جاتے ہیں پانی پہ ٹھہرنے والے

خون ناحق کہیں چھپ سکتا ہے ہم دیکھیں گے
حشر کے دن تو مکر جائیں مکرنے والے

زیست ذلت کی ہے مرجانے سے بدتر بخدا | کچھ خبر بھی ہے تجھے موت سے ڈرنے والے

۱۹۶ — ولہ — ۱۲

شمع خورشید ہے اس بزم میں جلنے کیلئے | چرخ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کیلئے
غم ہے بے صبر کلیجہ مرا ملنے کیلئے | اشک بیتاب ہیں آنکھوں سے نکلنے کے لئے
پاؤں بہکا تھا اگر نشہ میں بہکی نہ زباں | نام ساقی کا لیا گر کے سنبھلنے کیلئے
موت ہی نے شب ہجراں میں بہت کی تاخیر | ہم تو بیٹھے تھے بڑی دیر سے چلنے کیلئے
اتنا اطلس کی قبا پر نہ ہو نازاں طاؤس | پائے نازک بھی تو ہوں ناز سے چلنے کیلئے
یہ سمجھ کر سر رہ ہم نے بنایا ہے مزار | تم کبھی تو نکل آؤ گے ٹہلنے کیلئے
سہہ کے ایذا دل ناکام کو بنا لے پتھر | کام آئے گا یہ موذی کو کچلنے کیلئے
دل لگا ہے تو آنسو نہ بہاؤں کیونکر | نخل کو سینچتے ہیں پھولنے پھلنے کیلئے
پوچھے دشمن سے کوئی میرے قلم کا انداز | ہے یہ مار دو زباں زہر اگلنے کیلئے
دل ہو بیتاب تو یارب ہے طاقت مجھ میں | دونوں ہاتھوں سے کلیجے کو مسلنے کیلئے
دامن یار تلک ہاتھ نہ پہنچا نہ سہی | دل تو پہلو میں ہے سو ہاتھ اچھلنے کیلئے

ہے یہ بالوں کی سفیدی خبر مرگ اے نظم
دھوپ دیوار پہ چڑھتی ہے تو ڈھلنے کیلئے

۱۹۷ — ولہ — ۱۱

کہنیوں تک مرے لب سے لہو آتا ہے | کیا نہیں آتا ہے کافر کو وضو آتا ہے

اوس کو جو کوٹھی پہ دیکھا ہے تو ہے دل کا یہ حال
جب اوچھلتا ہے لب بام کو چھو آتا ہے

نشۂ مے سے ہے لغزش قدم ساقی میں
جھونکے لیتا ہوا محفل میں سبو آتا ہے

کوئی پوچھے تو سہی قتل کیا ہے کس کو
منہ چھپائے ہوئے وہ عربدہ جو آتا ہے

قبر میں بہر خدا چین سے سونے دو کہیں
ہے ستم ساتھ جنازہ کی بھی تو آتا ہے

ہیں کدھر رند ذرا جھوم کے چلنا دیکھیں
ابر کہسار سے اوٹھ کر لب جو آتا ہے

بس نہ دیوانے پہ چلتا ہے نہ ہشیار پہ کچھ
نہ تو دل آتا ہے قابو میں نہ تو آتا ہے

کھل گیا اتنا کہ دل میں ہے خلش مژگاں کی
خون اشکوں میں بقدر سر مو آتا ہے

زمزمہ تیرا کس آفت کا تھا اے مرغ چمن
آج گلزار میں غنچے کے لہو آتا ہے

لاش بسمل پہ جو ہے مشک فشانی منظور
بال کھولے ہوئے وہ غالیہ مو آتا ہے

نظم اغیار سے کیا قدر شناسی کی امید
کہیں ناکس کو خیال کس و کو آتا ہے

۱۹۸ ——— ولہ ——— ۳۲

نہ مروت نہ مدارا نہ وفا آتی ہے
ظلم آتا ہے ستم گر کو جفا آتی ہے

مژدۂ عیش لئے باد صبا آتی ہے
ساغر گل میں مئے ہوش ربا آتی ہے

انگلیاں کانوں میں رکھئے تو صدا آتی ہے
شور کرتی ہوئی اک سیل فنا آتی ہے

راستے میں قافلۂ عمر ہے سرگرم سفر
دل دھڑکتا ہے تو آواز درا آتی ہے

شک گذرتا ہے بط مے کی طہارت میں اگر
ایک غوطہ خم صہبا میں لگا آتی ہے

گل نے کیا جانے لحن پائی ہے کس کی آواز
کان بجتے ہیں ابھی تک وہ صدا آتی ہے

اے صبا سیر گلستاں میں تو مستانہ روی
تو قرا بے گل نسریں کی لٹا آتی ہے

موسم گل میں نہیں جامہ میں سماتا ہے گل
ٹھٹک آتا ہے گریباں قبا آتی ہے

شنوا ہو تو کوئی شوق تو ہو منزل کا
سیکڑوں کوس سے آواز درا آتی ہے

وحشت غربت سے بلبلی کا عجب ہوتا ہے خیال
سامنے حیرت نقش کف پا آتی ہے

منزل گور ہے اس دشت کی پہلی منزل
دل کے آجانے سے پہلے ہی قضا آتی ہے

دم جو لیتا ہے ذرا کوہ کنی میں فرہاد
جا کے شیریں اسے آواز سنا آتی ہے

خلوت وصل میں آ بیٹھی ہو جرأت کس کو
آتی ہے شرم بھی تو رو بقفا آتی ہے

اس کا دم بھرتے ہیں بیٹھے ہوئے دنیا الگ
ہر نفس میں خبر ارض و سما آتی ہے

خود تو مخمور ہے اوروں کو نصیحت زاہد
کچھ تجھے شرم بھی اے مرد خدا آتی ہے

لطف جب ہے کہ برسنے لگے میخانہ پر
جھومتی قبلہ سے گھنگھور گھٹا آتی ہے

کیا عجب ہے کہ صراحی بھی کرے سجدۂ شکر
جھومتی قبلہ سے گھنگھور گھٹا آتی ہے

وہ چلا گور غریباں کو خدا خیر کرے
لو قیامت سر خاک شہدا آتی ہے

دل ہے باتیں شب فرقت میں رہیں صبح تلک
اس کہانی میں کہیں نیند بھلا آتی ہے

آہ کے ساتھ نکلتا ہے جو کچھ دل کا غبار
جا کے گردوں پہ بھی وہ خاک اڑا آتی ہے

نہ تھمی عمر رواں لاکھ بھٹکتا رہا دل
سچ کہا ہے کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

راحتیں وادی غربت میں بھی تو نے بخشیں
چھاؤں ہے سبزہ ہے جنگل کی ہوا آتی ہے

آنکھ جب پڑتی ہے دنیا پہ تو پڑھتی ہے ہوس
جب دریچہ کوئی کھلتا ہے ہوا آتی ہے

ہائے یہ قبر کی گرمی یہ اندھیرا ہے ہے
کوئی کھلتا ہے نہ روزن نہ ہوا آتی ہے

کچھ دنوں تختِ سلیماں تھا ہوا پر اب تو
خاک اڑانے کو سلیماں کی ہوا آتی ہے

خاک میری ہوئی برباد تو ہو جانے دے
میں تو خوش ہوں ترے دامن کی ہوا آتی ہے

تھام باندھے ہوئے آئینہ کھڑا رہتا ہے
پاؤں پڑنے کے لئے آپ حنا آتی ہے

چھیڑ کرتا ہے یہ ابرو کہ پڑے گی تلوار
کہہ رہا ہے یہی گیسو کہ بلا آتی ہے

وصل کی رات بھی رہتی ہے لڑائی اکثر
بار ہا بیچ میں وہ زلفِ دوتا آتی ہے

تیوری چڑھ جاتی ہے فوراً یہ تماشا دیکھو
منتوں سے جو ہنسی اس کو ذرا آتی ہے

چاند نکلا کرے بڑھ بڑھ کے نکلتا ہے اگر
کہیں اس میں ترے عارض کی صفا آتی ہے

نظم آزاد ہے اب وہ ہے کنجِ خلوت
یاد حسرت جہاں بادِ صبا آتی ہے

١٩٩ ——— وله ——— ٢١

پاک کر اشک نہ اے شاہدِ خوش خو میرے
ہاتھ نازک ہیں ترے گرم ہیں آنسو میرے

ناصحا رونے سے آزردہ رہا تو میرے
ہم کو تسکین نہ پونچھیں کبھی آنسو میرے

برچھیاں مار کے اور دل و جگر چاک کر
درد و دارِ حرمِ شوق ہیں پہلو میرے

عہدِ طفلی سے جو ہیں سر پہ بلا میں نازل
جانتا ہوں کہ یہ منہ لگے ہیں گیسو میرے

درد و اندوہ سے پڑتی ہے یہی چین و شکن
غم کے ہاتھوں میں کیا دھرا ہے ابرو میرے

ہاتھ سے ہاپے میری اشک گئے پاک اُس نے
لڑیاں موتیوں کی ہو گئے آنسو میرے

پاؤں جھولے سے نکالے تھے کہ سودا لپٹا
عشق تھا بچپن کے شگوفے ہوئے گھنگرو میرے

اوس طرف لی کبھی کروٹ تو کبھی اُس جانب
ڈھونڈتے ہیں کسی محبوب کو پہلو میرے

ہیں گلے ہی جو کسی مہر لقا کے باہیں
آج شاخ گل خورشید ہیں بازو میرے

جیب میں جا یوں کہ ہوئی یکدلی و ہمدردی
اون کی آنکھوں سے نکلنے لگیں آنسو میرے

جب بڑھی دست دعا جانب ساقی ازل
بھر گئے بادۂ مقصود سے چلو میرے

جان پہچان نہیں گوشۂ غربت میں کوئی
روشناسوں میں ہیں آئینہ زانو میرے

دل کو تولے تو مرے حسرت دیدار ذرا
روشنی طور کی دیں سنگ ترازو میرے

آگیا حال مجھے حضرت موسیٰ کی طرح
آگے چمکا جو کبھی سامنے جگنو میرے

آج پر جوش ہے پر شور ہے مینائے دل
یہ سبب ہے کہ تلاطم میں ہیں آنسو میرے

سوز غم سے کسی کروٹ نہیں پایا آرام
شمع فانوس خیالی ہے پہلو میرے

کف افسوس ہی مل مل کے گیا کام تمام
خون امید سے لبریز ہیں چلو میرے

وا رہی کیا گرہ زلف تو کھل جائے گا
کوئی مضموں ہیں کہ بندھ جائیں گے بازو میرے

دیکھ کر تاروں کو یاد آتی ہے بزم شب عیش
صبح تک شام سے تھمتے نہیں آنسو میرے

کیا بیاں کیجیے بالوں کی سفیدی کا فروغ
عہد پیری میں تو ہے ابرو میرے

نظم اس بزم میں ہیں شاعر صاحب دل ہو یا
دل کے خالی نہیں مصرع کے بھی پہلو میرے

رنگ خون اشک میں گہرا نظر آتا ہے مجھے
پر خطر عشق کا صحرا نظر آتا ہے مجھے
بندہ اوس زلف میں اولجھا نظر آتا ہے مجھے
نظر عاقبت اندیش اک آئینہ ہے
نہ فلک دیکھ سکا اے ہر کال وہ فروغ
زال و سیمرغ کا تذکرہ اک افسانہ ہے
تجھ خیال کیا ہوں اوٹھانہ بانداز حجاب
اس کی رحمت کا ہے جوش اپنے گناہوں کا ہجوم
کچھ عجب حال ہے دیکھی ہے اوسکی تصویر
کشتی بادہ لگادے لب جو اے ساقی
پھر آنکھوں میں اوڑا لے گیا نقشہ تیرا
ساغر مے کے سوا اور نہیں اسکا علاج
آج وہ اوڑھ کے لنگی ہیں دوپٹہ آبی
بیخودی کو مری کافی ہے یہی اے موسیٰ
جستجو میں تری اوس دشت میں پھرتا ہوں میاں
چشم مژگاں کا تصور ہے جنوں کا ساماں

آج دامن پہ کلیجا نظر آتا ہے مجھے
خضر اس دشت میں پیاسا نظر آتا ہے مجھے
دہن یار کا چھالا نظر آتا ہے مجھے
شکل امروز میں فردا نظر آتا ہے مجھے
ترانہ صبح سے اترا نظر آتا ہے مجھے
دوست اس عہد میں عنقا نظر آتا ہے مجھے
آج بے پردہ ترا گہرا نظر آتا ہے مجھے
ایک سیلاب در یا نظر آتا ہے مجھے
نہ اندھیرا نہ اوجالا نظر آتا ہے مجھے
آج کے ابر میں دریا نظر آتا ہے مجھے
جب سے چہرہ بھی کچھ اترا نظر آتا ہے مجھے
دل قتیل غم فردا نظر آتا ہے مجھے
آسماں رنگ بدلتا نظر آتا ہے مجھے
کوہ پر لالہ حمرا نظر آتا ہے مجھے
کہ فلک آبلہ پا نظر آتا ہے مجھے
ان جگروں سے تو صحرا نظر آتا ہے مجھے

بند کی دید بتاں نے پری شیشے میں | ایک آفت کا یہ پتلا نظر آتا ہے مجھے
سن نہ لے وہ نفسِ بازپسیں کی آواز | جان دینے میں بھی کھٹکا نظر آتا ہے مجھے
درِ مقصود کا کیا خوب شگوں ہاتھ آیا | کفِ افسوس میں چھالا نظر آتا ہے مجھے
دعوی جوشِ صفا اور تمہارے آگے | آئینہ آنکھ کا اندھا نظر آتا ہے مجھے
حسرتِ دید سے جاں آ جو گئی آنکھوں میں | دم نکلنے کا تماشا نظر آتا ہے مجھے
داغ کو کیوں نہ کلیجے سے لگائے رکھوں | ایک دل سوز تو اپنا نظر آتا ہے مجھے
اے غمِ یار لہو میرا سکھانے والے | دل میں کچھ خونِ تمنا نظر آتا ہے مجھے
شہرہ ہی شہرہ ہے ہستی کا یہاں نام ہی نام | بیضۂ چرخ میں عنقا نظر آتا ہے مجھے
جس جگہ مہرِ نبوت نے شرف پایا ہے | آپ کا نقشِ کفِ پا نظر آتا ہے مجھے

ناز انداز ستم عشوہ کرشمہ حیدر
جو ہے وہ خون کا پیاسا نظر آتا ہے مجھے

٢٠١ ——— فعلاتن فعلاتن فعلا ——— ١٢

حسن پر خلقِ خدا لوٹ گئی | وہ ادا کی کہ قضا لوٹ گئی
چال پر اس کی قیامت اٹھ کر | مثلِ نقشِ کفِ پا لوٹ گئی
گرد کی طرح اٹھا میرا غبار | دو قدم چل کے ہوا لوٹ گئی
سیکھے ہم سے کوئی اندازِ سوال | عرش پر جا کے دعا لوٹ گئی
بعد میرے کوئی پرساں نہ ہوا | قبر پر آ کے وفا لوٹ گئی

دیکھنا وار ادا کا اوس کی
ساتھ بسمل کے قضا لوٹ گئی

وہ جو مستانہ چمن سے گذرا
شاخ گل موج صبا لوٹ گئی

دیکھنا جذب دل زار مرا
کشش کاہربا لوٹ گئی

واہ رے حسن بر و دوش و کمر
دیکھ کر زلف دوتا لوٹ گئی

چھاؤں آئی ترے کوچہ میں کہ دھوپ
خاک پر ظل ہما لوٹ گئی

چاندنی تا سر دیوار آ کر
دیکھ کر جوش صفا لوٹ گئی

آج سن کر ترے نالے اے نظم
بلبل نغمہ سرا لوٹ گئی

۲۰۲ مفاعلن فاعلن فعولن دوبار ۲۲

خبر ہوئی خود بخود یہ دل کو دہر دار الاماں نہیں ہے
خوشی یہ کہہ کر ہوئی روانہ مرا ٹھکانہ یہاں نہیں ہے

وہ عندلیب اسیر ہوں میں یہی کہ اذن فغاں نہیں تھی
قفس میں نقش و نگار کیا ہوں نفس ابھی خونچکاں نہیں ہے

کبھی نہ کیں میں نے دل سے باتیں کہ یہ مرا راز داں نہیں ہے
نہ حرف مطلب زباں تک آیا کہ یہ مری ہمزباں نہیں ہے

یہاں سے جانے کا نام آنا فریب میں دیکھ آ نہ جانا
طلسم ہے رہ گزار ہستی غبار ہر کارواں نہیں ہے

نہ جذب وہ کہربا میں پایا نہ رنگ وہ بیساخا میں پایا
کہاں کہاں میں نے جا کے ڈھونڈا دل و جگر کا نشاں نہیں ہے

نجانے ضبطِ فغاں نے کیونکر غمِ دروں کو چھپا کے رکھا
حریرِ رنگِ پریدہ کیا تو کہیں وہ شعلہ نہاں نہیں ہے

ادھر جوانی کی شام آئی ادھر ہوئی صبحِ عہدِ پیری
یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے

نہ کوئی اعلیٰ نہ کوئی ادنیٰ کہ ہے مساوات اپنا مذہب
جہاں کے ہم سب ہیں رہنے والے زمیں نہیں آسماں نہیں ہے

اگرچہ ہے بے ثباتِ عالم ٹھہر کوئی دم تو اے شبنم
ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

کمندِ فکرِ بلند سے جب فضائے خاطر کو ناپتا ہوں
تو کہتی ہے شانِ لاتناہی کہ اس کی حد لامکاں نہیں ہے

سہیل و شعریٰ و نسرِ طائر میں خطا ساغر میں ڈھونڈ لیتا
اگر یہ پیرِ مغاں نہ کہتا کہ یہ خطِ کہکشاں نہیں ہے

برا جو کتنا ہی کہہ لے واعظ برا نہ مانیں گے رند ہرگز
کہیں ہے دل میں ملال لانا یہ رسمِ دیرِ مغاں نہیں ہے

چمن میں آ کر یہ میں نے جانا ہے اتفاق اصلِ شادمانی

یہ دو ہوائیں بھی ہیں مل کر یہ نہرِ آبِ رواں نہیں ہے

کمندِ موجِ شعاع پا کر چلی سوئے اوجِ مہر شبنم

سپند رہ رہ گیا تڑپ کر کہ درد دل از زباں نہیں ہے

یہی تو ہے اس کا آستانہ نہیں بہت دور ہم کو جانا

وہ سامنے لا مکاں نہیں ہے وہ حلقۂ کہکشاں نہیں ہے

جھلک دکھا دی تھی کس نے اپنی کہ جوہروں میں تھا اک تلاطم

فضائے آئینہ ہے اوداس اب وہ طوطیٔ پرفشاں نہیں ہے

نہ اف کرو نگہ تاکی دیکھو چھری جگر پر لگا کے دیکھو

مجھے ملالِ ستم نہیں ہے مجھے مجالِ فغاں نہیں ہے

نگاہ آبستنِ ہوس ہے۔ ہوس ہے آلودۂ مناہی

تو اس سے بہتر ہے کم نگاہی کہ کچھ تماشا یہاں نہیں ہے

ہلاک ہونی کو اے مسافر چلا شبِ تار میں کدھر تو

کہ غولِ صحرا کے شعبدے ہیں یہ آتشِ کارواں نہیں ہے

بھلا ہو نادان واعظوں کا کہ میکدے کو کیا ہے رسوا

وگرنہ بادہ کشی کا چرچا کہاں نہیں تھا کہاں نہیں ہے

مقامِ تسلیم میں پہنچ کر اثر نہ خوف و رجا کا دیکھا

سنا یہ کرتے تھے واعظوں سے بہشت میں دھوپ چھاں نہیں ہے

یہ کیسی اے نظم چپ لگی ہے کہیں نہ رسوا کرے یہ تجھ کو
کوئی خموشی نہ ہوگی ایسی کہ جس میں کچھ داستاں نہیں ہے

۲۰۳ مفاعیلن مفاعیلن فعولن ۳۲

بھرا ساقی کس آبِ آتشیں سے
کہ چھلکا خون رنگِ ساتگیں سے

یہ کاوش خارِ صحرا ور ہمیں سے
چھٹا دامن تو الجھا آستیں سے

فلک شرما گیا اس کی جبیں سے
نہائے چاند زلفِ عنبریں سے

کبھی دیکھو ادھر بھی آنکھ اٹھا کر
اجازت لو نگاہِ شرمگیں سے

فلک دیتا رہا سرمایۂ دہر
نہ اپنا ہاتھ نکلا آستیں سے

کشیدہ رہ نہ یوں اے دامنِ یار
لپٹنا سیکھ زلفِ عنبریں سے

مبارک تم بسمل ہو کے مرنا
چھری پھرتی ہے دستِ نازنیں سے

قصاص آخر لیا قاتل سے میں نے
اسے مارا نگاہِ واپسیں سے

سفر کا میرے قصہ مختصر ہے
کہیں جانا ہے آیا ہوں کہیں سے

بہت نازک ہے اے ناصح مرا دل
کہیں ٹوٹے نہ حرفِ دل نشیں سے

پلٹ جاتا ہے فوراً بات کہہ کر
یہ عادت سیکھ لی ہم نے نگیں سے

تبسم خوں گرفتہ پر غضب تھا
لہو ٹپکا نگاہِ خشمگیں سے

سبب گردوں کے خم ہونے کا یہ ہے
کہ جھک کر توڑتا ہے زمیں سے

شرارِ عشق دامن جل گئے بھڑکا
چراغِ عقل گل کر آستیں سے

خوشی میں بھی لگائے غم کے پہلو
خدا سمجھے دل اندوہ گیں سے

اٹھائی آنکھ اس نے اور نہ دیکھا
نہ سنبھلا جام دست نازنیں سے

یہ شاخ گل ہے اے بلبل کہ صیاد
کہاں لے کر نکل آیا کمیں سے

بھلا محشر میں کیا واعظ سے امید
گنہ گار اس نے ٹھہرایا یہیں سے

کھلا یہ سابقے کے بعد ناصح
کہ حضرت آپ بھی ہیں کچھ یونہیں سے

سخن جب اصل ہی میں بے نمک ہو
تو کیا ہوتا ہے شور آفریں سے

عطائی دہر سے یوں ہاتھ کھینچا
شکن نکلی نہ اپنی آستیں سے

کہا میں نے قیامت ہو تو بولے
یہ مردہ کیا نکل آیا زمیں سے

عجب آزاد ہے دیوانۂ عشق
نہ دنیا سے غرض اوس کو نہ دیں سے

تری قربت کا اک زینہ ہے معراج
وہ منزل دور ہے عرش بریں سے

اشارہ تیری رحمت کا اگر ہو
لڑوں کشتی کراماً کاتبیں سے

وہیں ہو خار زار اے چرخ افسوس
چمن پیدا ہوئے جس سرزمیں سے

بلا انگیز ہے خال رخ یار
زحل اوترا ہے چرخ ہفتمیں سے

خیال خال باندھا دل میں میں نے
ستارہ دیکھتا ہوں دوربیں سے

یہاں کس کو خبر دور فلک کی
کسے فرصت ہی دور ساتگیں سے

تعلی اہل رفعت نے نہ چھوڑی
گئی گردوں تک خاک اوڑ کر زمیں سے

نگاہ مست نے رسوا کیا ہے
اوٹھا طوفان موج ساتگیں سے

جلائے نظم آئینہ پر اپنے
ہوئی گرد نگاہ عیب بیں سے

۲۰۴

خیالِ چشمِ فتاں ہر گھڑی ہے
لبِ اوس کا پھول کی اک پنکھڑی ہے
چلو صحرا کو یہ دہن ہر گھڑی ہے
یہ غمزہ زلف و رخ پر یاد رکھنا
نہیں رنگِ چمن کو پائیداری
دلِ غمگیں مرا وہ کربلا ہے
نظر کیا جانے شوخی اوس ادا کی
گھلا جاتا ہوں میں غم ہو کسی کو
لحد تک پھر تو ہے پیری ہی پیری
مجھے مارا تری اس نازکی نے
وہ آئے نزع میں بالیں پہ میری
یہ نہیں رہنے دو مجھ کو نیم بسمل
بھلا تم اور حیا او دل کسی کا
ملے جائیں یہ منہ مانگی مرادیں

۲۴

اجل سچ کہتے ہیں سر پر کھڑی ہے
گراں جس پر کہ مسی کی دھڑی ہے
یہی تدبیر مجھ کو بن پڑی ہے
کبھی کا دن کبھی کی شب بڑی ہے
یہ سمجھو فصلِ گل اک پھلجھڑی ہے
کہ لاشِ آرزو جس میں گڑی ہے
کہ یہ تلوار تو دل پر پڑی ہے
کوئی پوچھے کہ تجھ کو کیا پڑی ہے
غنیمت ہے جوانی جو گھڑی ہے
سروہی جب پڑی اوچھی پڑی ہے
یہ ساعت نیک ہے اچھی گھڑی ہے
تمہاری دل لگی تو دو گھڑی ہے
سراسر جھوٹ ہے اور دھڑی ہے
کہ بندوں پر تری رحمت بڑی ہے

شہنشاہوں سے بگڑا رہتا ہے وہ
جسے تیری فقیری بن پڑی ہے

الٰہی تو دل بے آرزو دے
مجھے حسرت میں حسرت یہ بڑی ہے

مرے پاس آتے آتے رک رہے وہ
اسی سے سانس سینہ میں اڑی ہے

جہالت میں سلوکِ راہِ عرفاں
اندھیری رات ہے منزل کڑی ہے

میں پہلی ہی اسیری سے تھا سمجھا
کہ بابا عاشقی کا ہتکڑی ہے

نکالیں تو قدم وہ گھر سے باہر
قیامت ہاتھ باندھے ہی کھڑی ہے

متاعِ صبر پھونکی سوزِ غم نے
یہ چنگاری کہاں جا کر پڑی ہے

گنہ ہونگی گھٹائے جائیں آگے سائے
سنا ہے دھوپ محشر کی کڑی ہے

نہ ہو بیزار مجھ سے تو تو اے قبر
مری صورت گلی ہے یا سڑی ہے

وفا کہتی ہے اب حیدر نکل جا
ادا کہتی ہے ایسی کیا پڑی ہے

۲۰۵ ——— ۱۹

وہ آئی فوجِ گل وہ برق چمکی
وہ اڑتی آتی ہے بیرق علم کی

مجھے خواہش ہے ساقی جامِ جم کی
بھلا ہو خیر تیرے دم قدم کی

یہ کہتی ہے صفِ مژگاں صنم کی
کہ راہیں بند ہیں دیر و حرم کی

نہ دیکھ اے نقشِ پا ان شوخیوں کو
تری آنکھوں میں خاک اسکے قدم کی

فلک نے کھلا رہا ہے لالہ و گل
یہ لاشیں ہیں شہیدانِ ستم کی

سمجھ لے ہاتھ پھیلانے سے پہلے
چلیں گی برچھیاں لاؤ نعم کی

مجھے غش میں پڑا رہنا ہے بہتر
ہوا ہے گرم دامان کرم کی

ہمارے دور میں بھی ہے وہی جام
خرابی کی ہے جس نے ملک جم کی

جو میری طرح سے کھینچا دم سرد
تو سانس اکھڑی نسیم صبحدم کی

نہ کیوں قسمت پہ اپنی ہوں میں نازاں
کہ گنجائش نہیں ہے بیش و کم کی

نہ رکھنا زیست میں دم کا بھروسا
کسی نے کیا وصیت مرتے دم کی

وطن کو مڑکے غربت میں جو دیکھا
تو اک زنجیر تھی نقش قدم کی

یہ دل ہے اور تیری عشق کا داغ
قسم ہے مجھ کو قندیل حرم کی

عطا چھٹ جائے تو چھٹ جائے لیکن
ادا چھٹتی نہیں اہل کرم کی

رہائی دام گیسو سے ہوئی یوں
چھٹیں نبضیں اسیران ستم کی

وہ دل آفت زدہ وہ کوچہ زلف
وہ تاریکی وہ راہیں پیچ و خم کی

گریباں تک نہ پہنچا ہاتھ اس کے
پشیماں ہو کے بھی گردن نہ خم کی

ضرور اب اعتبار آئے گا سب کو
قسم کھاتے ہیں وہ جھوٹی قسم کی

حذر لازم ہے بدگویوں کو اے نظم
کہ ہے کالی زبان میرے قلم کی

۲۰۶ ـــ غزل مشاعرہ یمین السلطنۃ ذوالوزارتین دولت آصفیہ ـــ

چہ سامان سیہ کاری نہ کردی
ولے کردی و پنداری نہ کردی

درین گلشن بسانِ نکهتِ گل — ز خود رفتی و خودداری نه کردی
و زِشْ از سجدهٔ تو دور تر بود — باندازهٔ نگون‌سازی نه کردی
سرت بار معاصی بر نتابد — چرا فکر سبکباری نه کردی
خلاف از آبروی عشق آئینس — چو بر رخ اشک غم جاری نه کردی
ازین خواب گران غفلت آوے — تو گاہے قصد بیداری نه کردی
بدین عقل تو و اغطا آفرین است — که غم خوردی و میخواری نه کردی
من از تو این سخن باور نه دارم — که دل بروی و دل آزاری کردی
بجز آن کنند که راز عشق را فاش — تو در مستی و هشیاری نه کردی
خطا کنند که در این کوچهٔ عشق — لحاظِ ذلت و خواری نه کردی
شده راز عطایت فاش نے شاد — که پنهانش ز بسیاری نه کردی

خدا بوده است آمرزنده اے نظم
نه کردی بیش او زاری نه کردی

۱۴ — مفاعیلن چار بار — ۲۰۷

نہ جی بہلا مرا بوئے گل و رنگ گلستاں سے
رہا آوارہ مثل گرد باد اٹھ کر بیاباں سے
نگہ بے باک بکھری کاکلیں سرکا ہوا آنچل
لڑانا اس طرح آنکھ آئینہ کی چشم حیراں سے

غلامی کرکے شاہی مصر کی پائی تو کیا پائی
نہ یوسف کو مناسب تھا نکلنا چاہِ کنعاں سے

ہوا سے کھل رہے ہیں پھول یہ ماجرا دیکھا
کہ جاتے ہی ترے ہاؤ اٹھنے لگے شعلے گلستاں سے

تڑپنا تجھ میں نہیں اے آہ گرنا دیکھ بجلی کا
اثر تجھ میں نہیں اے درد اٹھنا سیکھ طوفاں سے

جہاں فانی ہے لیکن ہے دلیل ہستی باقی
وجود سایہ ہو جس طرح خورشید درخشاں سے

ہوا دل غم سے چور اضطراب اب بھی نہیں جاتا
بچانا شیشۂ ناموس یارب سنگ لرزاں سے

مجھے نشو ونمائے تختۂ سوسن کا شک گزرا
وہ اک پرواز تھی طاؤس کی صحنِ گلستاں سے

عجب کیا نرگسِ بیمار کی آنکھوں میں نور آئے
یہ بادل ہے کہ سرمہ اڑ کے آیا ہے صفاہاں سے

میں اہلِ ہوش کی اس چارہ سازی کا ہوں دیوانہ
نہ مانگیں طوق او سے گھٹتا ہو دم جس کا گریباں سے

ادب کا ہے تقاضا ہاتھ میرے باندھ دے کوئی

انہیں غو ہے الجھ پڑنے کی ناصح کے گریباں سے

نگاہِ غور کی جس شخص نے اپنی حقیقت پر

تو شرما کر نہ پھر اس نے اٹھایا سر گریباں سے

بسانِ سیل ہم قطعِ تعلق کرتے رہتے ہیں

بہ شکلِ موج گر پیدا گریباں ہو گریباں سے

پلا پھر نظم کو جامِ جنوں انگیز اے ساقی

کہ دردِ سر ہو خمیازۂ چاکِ گریباں سے

۱۷ ولہ ۲۰۸

نہ اب نکلوں گا ساری عمر کوئے مے پرستاں سے

کہ دیکھی میں نے ہمدردی یہیں انساں کو انساں سے

ملا ہے گل فشانی کا سبق مجھ کو گلستاں سے

گہر ریزی مرے خامہ نے سیکھی ابرِ نیساں سے

ہر اک ذرہ یہ چشمک جھانک کر روزن سے کرتا ہے

کہ میں واقف ہوں تحلیلِ شعاعِ مہرِ تاباں سے

سماں اب تک شبِ عشرت کا پھرتا ہے نگاہوں میں

نکل آنے کو تھی سلمائے فطرت خود شبستاں سے

غلط ہے اس سرا میں راہ ہستی کا کب ٹھہرا

مگر ہاں کچھ پتا ملتا ہے اس کا گرد جولاں سے
اثر تا عرش پہنچا اک نگاہِ حسرت آگیں کا
تلاطم پڑ گیا ہے جنبشِ داماں مژگاں سے
نہ ہو انساں کبھی ممنونِ منت ایسے ویسوں کا
زمیں میں گڑ گیا ہوں میں فلک کے بارِ احساں سے
کئے دیتی ہے بیخود بوئے گل ہاتھوں میں رعشہ ہے
سنبھل اے باغباں گرنے نہ پائیں پھول داماں سے
شکستِ مدعا کا سامنا ہے دونوں جانب سے
کسی کا دل ہے نازک تر کسی کے عہد و پیماں سے
رخِ روشن پر اک خالِ سیہ میں دیکھ کر سمجھا
عروجِ ماہ میں اوترا یہ تارا اوجِ کیواں سے
پتہ ملتا نہیں راتوں کو اب خوابِ رمیدہ کا
غرض کیا طائرِ شبگرد کو فکرِ شبستاں سے
وہ اہلِ کرم سے راہ چلتے فیض پاتے ہیں
صبا اکثر معطر ہو کے نکلی ہے گلستاں سے
ٹھکانا اور بھی کوئی ہے کیا خانہ بدوشوں کا
کدھر جاتا ہے نکلے گرد باد اوٹھ کر بیاباں سے

غبارِ رہ گذر سے رہروؤں کا ماجرا سن لو
خبر اوڑتی ہوتی آئی ہے کچھ شہرِ خموشاں سے

مجھے بے صبر کیوں کہیئے خطا یہ اشکِ خونیں کی ہے
کہ عادت ہے ٹپک پڑنے کی اوس کو نوکِ مژگاں سے

صدف کا سا جگر رکھ تو ہو آبستنِ گوہر
شکایت سنگریزوں کو عبث ہے ابرِ نیساں سے

زباں کج مج ہے اور دعوی ہے رنگیں خیالی کا
شفق پھوٹے گی اب آ کے نظمِ خون گرمی وستاں سے

۴ ولہ ۲۰۵

رعایا خوش ہے شہ کے بذلِ ظاہر فیضِ پنہاں سے
پہنچتی ہے طراوت خشک و تر کو فصلِ باراں سے

کئے ہیں انتظام ایسے ہوئے ہیں انتخاب ایسے
دکن کے پھر گئے دن عہدِ عثمان علیخاں سے

عجب کیا ہے زمینیں بے چراغ آباد ہو جائیں
یہ سنتے ہیں گزرنے کو ہے دجلہ اب بیاباں سے

عجب کیا ہے سنا کر رعبِ سلطانی کا افسانہ
رسن میں باندھ کر شیروں کو لے آئیں نیستاں سے

اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوئے سب پہلی منزل سے
خدا معلوم دو دو اشک بھی نکلے تھے کس دل سے

سنا جادو کو جل جاتے ہوئے کاجل کے بھی تل سے
نکل آیا ہے اک فتنہ سا فتنہ چاہِ بابل سے

اسیری میں بھی آزادی میں بھی رونا رہا ہم کو
قفس میں آئے بھی مشکل سے باہر نکلے بھی مشکل سے

ریاضت کشت زار آرزو کی سعی بے جا ہے
وہی اچھے رہے کچھ ہاتھ دھو بیٹھے جو حاصل سے

فلک کی گردشیں ہیں اور جائے امن ناپیدا
بھنور میں کشتیِ عمرِ رواں ہے دور ساحل سے

نہیں بحرِ فنا میں ڈوب مرنے کے سوا چارہ
ملا پانی نہ چلو بھر کسی پیاسے کو ساحل سے

ہزار آنکھ اے فلک ہے تیرے کشتہ کی تماشائی
تماشے جھلملے میں آئینہ داری بسمل سے

تعلق سے جہاں کے اس طرح آزاد ہو جا تو
نکل جاتا ہے نالہ جس طرح طوق و سلاسل سے

میں اک افسردہ دل ہوں جاؤں کیونکر بزم عشرت میں
چمن میں بج رہا ہے ارغنوں صوت عنادل سے
میں اک شوریدہ سر ہوں مجھ کو لے جاؤ نہ دریا پر
نہ دیکھا جائے گا موجوں کا ٹکرانا بھی ساحل سے
شب غم میں ہوا ہے تجربہ یہ بارہا مجھ کو
اجل آتی ہے آسانی سے نیند آتی ہے مشکل سے
ذرا تو ہی بتا دے اب کدھر جاؤں کہاں بیٹھوں
جدا ہو کر ترے در سے نکل کر تیری محفل سے
حدی خواں دیکھنا ایسا نہ ہو پامال ہو جائے
ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی جاتے ہیں محمل سے
غبار اپنا فلک فرسا رہا شاہد ہے خود گردوں
کبھی دب کر نہیں رہتے کسی مد مقابل سے
کبھی چھوڑا نہ ہم نے شیوۂ اہل مروت کو
کبھی جھپکی نہ اپنی آنکھ دشمن سے نہ قاتل سے
جو ہیں بیدرد اُن کا ذکر کیا جو چاہیں وہ سمجھیں
تراوش و جلکی بھی ہے پر افشانی بسمل سے
بڑے ہشیار ہیں اہل کرم بھی میں تو قائل ہوں

کہ جو دیتے ہیں اوس سے بڑھ کے لے مرتے ہیں سائل سے

بہانہ ہو گیا ہی او ستمگر برق خرمن کا

نجانے آہ نکلی تھی یہ کس دکھتے ہوے دل سے

ہمیں یہ بھی نہیں اب یاد حسرت کہتے ہیں کس کو

نہ آئی تھی کبھی دل میں نہ نکلی تھی کبھی دل سے

مرے غم سے کہیں احباب بھی غمگیں نہ ہو جائیں

یہی رہتا ہے اندیشہ کہ دل کو راہ ہے دل سے

رہی جب ناخن تدبیر میں باقی نہ گیرائی

کھٹکتی ہے جگر میں یہ بھانس اب نکلی تھی جو دل سے

مکرنے میں ہے ظاہر تیرے چہرے سے پشیمانی

زباں سے قتل کا انکار ہی اقرار ہے دل سے

مرے پہلو سے آخر اوٹھ گیا وہ بدگماں ہو کر

تڑپ جانے کا شکوہ دل کو مجھ سے ہے مجھے دل سے

نہ ہو جو بات دل سے کچھ مزہ اوس میں نہیں آتا

محبت چاہیے دل سے عداوت چاہیے دل سے

خدا ہی نظم کا حافظ ہے اب کہدو یہ حافظ سے

شب تاریک بیم موج کشتی دور ساحل سے

۲۱۱ نہ قصر دلکشا رکھے نہ باغ جانفزا رکھے ۱۵
بڑی جاگیر تو یہ ہے کسی کے دل میں جا رکھے
غرض اس پیر زال دہر سے کس کی بلا رکھے
نہیں میں ناز کش اس کا یہ نازلینے اوٹھا رکھے
رگِ گردن پہ جس کو ناز ہو تو جھٹکے دل اوس سے
یہ وار ایسا ہے جو تسمہ نہ گردن میں لگا رکھے
غم و شادی کو میں ایسا ہی سمجھا جس طرح کوئی
لگائے خون دامن میں کہ ناخن پر حنا رکھے
وہ حاضر ہے جدھر چاہے اودھر سجدہ کرے انسان
وہ ناظر ہے جدھر چاہے اودھر دست دعا رکھے
گواہی دے رہے ہیں روز محشر دست و پا میرے
یہ حال اپنوں کا ہے غیروں سے پھر امید کیا رکھے
یہ کہہ کر ہاتھ دنیا سے اوٹھایا اہل ہمت نے
مناسب ہے وہاں کے واسطے بھی کچھ اوٹھا رکھے
تری سرکار سے میں ہوں قناعت فیض کو پہنچا
تجھے اللہ ساری خلق کا حاجت روا رکھے

فقط دو قرص ناں ہیں نعمت خوان پیر گردوں میں
اگر کھائے تو کیا کھائے اگر رکھے تو کیا رکھے

براق آیا زمیں پر عرش سے اور عرش پر پہنچا
فلک کو رہ گئی حسرت قدم یہ با دپا رکھے

نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع گردوں لاکھ درپے ہو
اسیر قید غم رکھے گرفتار بلا رکھے

لحد میں مال و زر کچھ کام آئیگا نہ منعم کے
جسے خود دیکھو دکر گاڑا ہوا امید اوس سے کیا رکھے

کسی کے کوئی کام آتا نہیں وہ وقت آیا ہے
کہ انساں ہاتھ سے اپنے لحد اپنی بنا رکھے

جہاں میں آئے ہیں تنہا ہی اور تنہا ہی جانا ہی
بشر کاہیکو دو دن کے لئے جھگڑی لگا رکھے

کسی کو ملک و مال آساں نہیں دیتا کبھی گردوں
اگر یوسف بھی ہو پہلے کنوئیں اوس کو چھپا رکھے

١١ ولہ ٢١٢

میں ہوں بندوں میں اوسکے جو محبت کی نظر رکھے
میرا احساں عمر بھر مانوں وہ احساں عمر بھر رکھے

ہمیشہ انتظارِ آمدِ بادِ سحر رکھے
بھروسہ زیست پر مثلِ چراغِ رہگذر رکھے
یہاں جو خار ہے دامن کشِ برقِ تجلی ہے
قدم راہِ سلوک و معرفت میں دیکھ کر رکھے
جو محرم ہو نہ راہِ شوق کا اوس کو یہ مشکل ہے
نظر بھی سوچ کر ڈالے قدم بھی دیکھ کر رکھے
نزاکت راہ چلنے کو ہے مانع بات کرنے کو
حسیں ہو کر بھلا کچھ تو دہن رکھے کمر رکھے
سکھاتا ہے غرورِ حسن یوں عاشق کشی اوس کو
زمیں پر پاوں کیوں ٹھوکر وہ قدموں پہ سر رکھے
دبستانِ وفا سے پڑھ کے یہ دو حرف میں نکلا
کسی کا ہو رہے خود یا کسی کو اپنا کر رکھے
کبھی ششدر نہ ہو اس تختۂ نرد دہر میں پھنس کر
نکل جانے کو اپنے راستہ چلنے کو گھر رکھے
صدا ہے طائرِ قبلہ نما کی پر فشانی میں
فلک دے لاکھ گردش منہ جدھر رکھے اودھر رکھے
بہت سے دل میں ہیں مضمون جو لب تک آتے جاتے ہیں

مناسب ہے، مجھے بھی ساتھ اپنے نامہ بر رکھے
قدح کش نظم ہے لیکن نہ ایسا بھی کہ اے واعظ
شراب کبر و نخوت شیشۂ توبہ میں بھر رکھے

۱۵ ۲۱۳

ملا تھا ایک ساغر زہر غم سے نیلگوں وہ بھی
ستم ہے اوس پہ تعزیر اے فلک حد سے فزوں وہ بھی
اثر ہوتا نہ ہرگز اہل دل پر صور محشر کا
صدائے چنگ ہو گی یا صدائے ارغنوں وہ بھی
بہار باغ اک ہنگامہ ہے چاک گریباں کا
جسے ہم جوش گل سمجھے تھے ہے جوش جنوں وہ بھی
نگیں کو ناز تھا جو سر پہ اپنے اور زیبا تھا
ہوا ہے نام کی خواہش میں لیکن سرنگوں وہ بھی
ہدف ہونے سے دل کو کس طرح کوئی بچا لیتا
نگاہ اس کج ادا کی اور نگاہ پرفسوں وہ بھی
تڑپ کر دل جو رہ جاتا تھا بہلے تو جاتا تھا
غنیمت تھی مجھے اک فرصت صبر و سکوں وہ بھی
فغاں کرنے پر اوس وادی میں تقصیر بھی ہے آمادہ

چھپے رہنے سے دل میں بن گئی سوز دروں وہ بھی
جہاں ہے وار ماتم شیوۂ گردوں سے ظاہر ہے
کہ پہنا ایک ہی خرقہ ہمیشہ نیلگوں وہ بھی
ملے دنیا بھی اور عقبیٰ بھی یہ تو ہو نہیں سکتا
کیے جاتی ہے لیکن حرص میری یہ بھی لوں وہ بھی
تباہی میں کبوتر کی طرح تھا کوکب طالع
ہوا آخر شکار پنجۂ بخت زبوں وہ بھی
کسی عیار نے باتیں سنا کر لے لیا دل کو
فسانہ میں تو سمجھا تھا مگر نکلا فسوں وہ بھی
نہیں اب داد خواہی کی ہوس اے داور محشر
کہ میں بھی ہوں پشیماں شرم سے ہے سرنگوں وہ بھی
مجھے سوز سیہ میں سایہ اپنا یاد آتا ہے
کہ میرے ساتھ تھا آوارۂ دشت جنوں وہ بھی
کہوں قصہ میں واعظا عنوان نوجوانی کا
حدیث عیش رفتہ سن کہ تھا خیر القروں وہ بھی
کوئی حرف تمنا ضبط کرتا ہوں جو اے حیدر
تو آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے بن کر اشک خوں وہ بھی

ملی تھی راہ میں منزل سراب عمر فانی کی
یہاں نقش قدم سے اپنے تو نے کیا نشانی کی
صدا یہ آرہی ہے دور سے برگ خزانی کی
کبھی ہم نے بھی لوٹی تھیں بہاریں زندگانی کی
کسی پہ دل کا آنا موت تھی عہد جوانی کی
نہ بھولوں گا اسے یہ جان ہے ساری کہانی کی
کرامات صفا سے قلب کو پوچھو تو شبنم سے
فروغ شمع رقصاں لے اوڑی اک بوند پانی کی
تجلی بھی ہوئی آخر تو موسیٰ نے نہ کچھ دیکھا
چکا چوندھ ایسی تھی آنکھوں میں برق لن ترانی کی
غبار راہ اٹھ کر مرا منزل کی جانب چند گام آیا
یہ ٹھوکر پڑ گئی کس رہ نورد کاروانی کی
کوئی حد بھی ہے ہستی کی ہزاروں سال جب گزرے
تو ہم تک روشنی پہنچی ہے شعریٰ یمانی کی
بگولوں میں نظر آتی ہے خاک و باد گشتی
عیاں ہے برق و باراں سے لڑائی آگ پانی کی

خیال آیا نہ مجھ کو حیف بعض الظن اثم کا
پشیماں ہوں کہ ناصح سو میں نے بدگمانی کی

حکومت کا مزہ ہم نے اوٹھایا بڑھ کے شاہوں سے
کہ اپنے نفس سرکش پر ہمیشہ حکمرانی کی

خجالت سے خضر کا منہ چھپانا ہی مناسب ہے
کہ خواہش اور پھر وہ بھی حیات جاودانی کی

علم رکھتا نہیں گر تو قلم سے نام پیدا کر
مقام رشک ہے شہرت درفش کاویانی کی

یہ ہے نادر مرقع کارگاہ نظم کا حیدر
کہ ہیں لفظوں کے آئینہ میں تصویریں معانی کی

۱۱ ولہ ۳۱۵

بڑا غم ہو گا قتل عاشق ناشاد و مضطر سے
یقیں ہے تیغ قاتل خون روئے چشم جوہر سے

بھلایا حسن دنداں سے لب نازک کی خوبی کو
بجھا دی آتش یاقوت تو نے آب گوہر سے

خرام ناز تیرا دیکھ کر ایسا عرق آیا
کہ آخر نقش سارے دھو گئے طاؤس کے پر سے

جو نازک طبع ہیں وہ سخت دل کے منہ نہیں لگتے
نہ باور ہو لڑا کر دیکھ لو شیشہ کو پتھر سے

حسینوں کی نزاکت دیکھ کر دھوکا نہ کھا جانا
کہ رخسارے تو ان کے پھول سے ہیں دل میں پتھر سے

خدا کے سامنے ہوگا خرامِ ناز کا شکوہ
گواہی دل کے پس جانے کی لینگے اہلِ محشر سے

اگر اونکی طرح میری پلک جھپکی ہو تو کہہ دیں
لڑائی آنکھ میں نے رات بھر ایک ایک اختر سے

کرامت تو نے رندوں کی نہیں دیکھی ہے ای زاہد
بڑھا کر ہاتھ بھر لیتے ہیں ساغر حوضِ کوثر سے

اثر دیکھے کوئی بیتابیِ دل کے جو مضموں ہیں
مرا مکتوب آگے جاتا ہے بالِ کبوتر سے

کسی کے شوقِ آرائش نے کی غارتگری کیسی
لیا اشتاق سے دل آئینہ چھینا سکندر سے

مروت نام کو تجھ میں نہیں ای برق کیا کہنا
لگا دی آشیاں میں آگ اور ہنستی ہے اوپر سے

ولہ

۱۲ ۲۱۶

پری تھی آئینہ خانہ میں عکسِ حسنِ دلبر سے
صدا پرواز کی آئی پر افشانی جوہر سے
سنو تم وصف ہم سے نا ہم نے پیمبر سے
پیمبر سن کے آئے ہیں زبانِ موجِ کوثر سے
جنوں میں سر کو ٹکرانا کبھی خالی نہ جائیگا
پری شیشہ سے اور شیشہ نکل آئیگا پتھر سے
سبک سر ہو کے جو خفت اوٹھائی ہے نہ کچھ پوچھو
گیا میں ڈوبنے پانی نہ اونچا ہو سکا سر سے
کھلا جب ہے کہ سب تیرے اشارے کی کرشمے ہیں
جگر کو تیر سے اک عشق سے گردن کو خنجر سے
سنبھل کر ہر قدم راہِ فنا میں چاہیئے رکھنا
کہیں دیوار بن جائے نہ اوٹھ کر گرد ٹھوکر سے
شبِ یلدا مری آبستنِ صبحِ قیامت ہے
مجھے محشر کے فتنے جھانکتے ہیں چشمِ اختر سے
صبا نے اے گلِ تر کھو دئیے تیرے حواس آخر
کہا رازِ نہفتہ فاش اور ہنستا کھلا اوپر سے

سویدائے دل سوزاں سے کیا اسپند کو نسبت
کمال ضبط تو یہ ہے دھواں اٹھے نہ مجمر سے
کہیں میں سر پہ سنگ تیز دنداں چابتا ہوں میں
عبث ہے فکر اب پانی تو اونچا ہو چکا سر سے
جو ہو حاصل دل روشن نہ کر لاف نسب ہرگز
صفا میں آئینہ کی فرق آجاتا ہے جوہر سے
غنیمت کیوں نہ میں سمجھوں دل پر درد کو حیدر
کہ یہ دولت جو ملتی ہے تو ملتی ہے مقدر سے

۲۱۷ ولہ ۲۹

شب ہجر میں اگر یاد آئے فلک وہ آفتاب آئے
یقیں ہے خرمن تسکیں تو برق اضطراب آئے
شب غم میں کسی پہلو نہیں ممکن کہ خواب آئے
تو کیوں کروٹ بدلوانے کو جوش اضطراب آئے
بہ رنگ مشک ترپا ہوں نہ گو رنگ خضاب آئے
نہیں ممکن جوانی کی سی رخ پر آب تاب آئے
مروت اسے ظالم کو نہ کچھ شرم و حجاب آئے
جو کچھ کہیے تو سیدھی بات کا الٹا جواب آئے

روانی عمر کی ہے وادیٔ ہستی میں سیل آسا
حباب و موج کے مانند ہم پا در رکاب آئے

بڑھاتا ہے عبث تو ہاتھ دنیا کی طرف ناداں
خبر لے ہوش کی ہستی میں کیا موج سراب آئے

ترش روئی کی عادت تلخ کامی سے ہوئی پیدا
ہمارے سامنے ہو جائے سرکہ گر شراب آئے

نکلتا ہے اشارہ جھلملانے سے ستاروں کے
ازل کے روز سے لے کر دل پر اضطراب آئے

میں کیا جانوں گنہ اے کاتب اعمال کتنے ہیں
یہ جھگڑے اوس سے کر جس کو حساب آئے

عناں گیر اوس کے توسن کا ہو جذب شوق تنہا ہو
غبار ناتواں تا حلقۂ چشم رکاب آئے

تلون کی بھی حد ہے اک نگہ اتنے کرشمے ہوں
حیا آئے حجاب آئے غضب آئے عتاب آئے

ترے کہنے سے میں توبہ تو کر لیتا ہوں اے واعظ
رہا جاتا نہیں پھر جھوم کر جس دم سحاب آئے

ہوائے سرد مہری چل رہی ہے سارے عالم میں

نہ ٹھیرتا ہوا وقت سحر کیوں آفتاب آئے

فسانہ کی عوض اے داستاں گو پڑھ کوئی افسوں
اوتر آئے پری شیشہ میں گر آنکھوں میں خواب آئے

جہاں میں سرکشی کی ہم نے اس پر بھی شرار آسا
سراپا اضطرار آئے ہمہ تن اضطراب آئے

ملانا آنکھ پھر منہ پھیر کر تیوری چڑھا لینا
یہ مطلب ہے چھری وہ مارئے جس کو نہ تاب آئے

ہوا ثابت یہ عیب دونوں کی ہستی اعتباری ہے
نہ کیوں گردوں سے پھر آنکھیں لڑانے کو حباب آئے

نہ آئے وہ ستمگر اور بہار اس طرح سے گذرے
تڑپ کر برق سہ رہ جائے گھر گھر کر سحاب آئے

نگاہِ شوق کے چلتے گیا صبر و قرار آخر
اسی رستہ سے شاید کاروانِ اضطراب آئے

نشاطِ عالمِ فانی ہے توام رنج و حرماں سے
سمجھے چشمِ پر خوں اوس کو گر جامِ شراب آئے

گذرتا ہے کچھ اس انداز سے لشکر حوادث کا
کہ اوڑ کر سر پہ گردوں کے غبارِ انقلاب آئے

خدا نے کی ہی جنت واعظوں ہی کے لئے پیدا
اگر یہ میکدہ میں بھی گئے ہو کر شتاب آئے

بقدر یک نگہ مہلت نہ دی جب انتظار اوس کا
تو مشکل ہے بقدر یک مژہ آنکھوں میں خواب آئے

بہت اصرار کرنے سے اوٹھائی تو ہی آنکھ اوس نے
مگر چتون یہ کہتی ہے کہ آئے اور حجاب آئے

اگر سو مرتبہ آئے بہار اے آسماں تو کیا
کوئی گردش تو کر ایسی کہ پھر فصل شباب آئے

یہ راتیں ہجر کی تارے ہی گنتے گنتے کٹ جائیں
فلک سمجھوں گا میں تجھ سے ذرا روز حساب آئے

سوا شام الم کے اور کیا دیکھیں گے دنیا میں
اوٹھیں اسوقت سو کر جب لب بام آفتاب آئے

حذر ہے زاہد سالوس سب کو تیرے سایہ سے
اگر آئے تو تھراتا ہوا تیر شہاب آئے

رواں ہے توسن عمر اور پڑی جم نہیں سکتی
تو پھر کس طرح قابو میں پائے شتاب آئے

١٨ ولہ ٢١٨

ادھر دل میں مری حسرت پہ حسرت بڑھتی جاتی ہے
ادھر شوخی پہ شوخی ہے شرارت بڑھتی جاتی ہے

زمانہ میں نہ لیگا نام کوئی عشق بازی کا
ہمارا سانحہ سن سن کے عبرت بڑھتی جاتی ہے

الٰہی دل ہے یا پرکالۂ آتش ہی پہلو میں
جو سوزش گھٹتی ہے گرد کدورت بڑھتی جاتی ہے

انھیں اللہ اکبر یہ خوشی گھر اپنے جانے کی
سحر کے ساتھ چہرے کی بشاشت بڑھتی جاتی ہے

جدائی میں مرا شاخ خزاں دیدہ کا عالم ہے
کہ رونق گھٹتی جاتی ہے نقاہت بڑھتی جاتی ہے

دباتے جاتے ہیں لالے کے تختے کوہ کا دامن
گھٹا کے ساتھ گلزاروں کی وسعت بڑھتی جاتی ہے

احبا گنتے ہیں گھڑیوں کے بدلے میرے نالوں کو
کہ جوں جوں رات جاتی ہے شکایت بڑھتی جاتی ہے

نہ پوچھو ہجر کی شب دم نکلنے میں ہے کیا لذت
چلی آتی ہے میٹھی نیند غفلت بڑھتی جاتی ہے

بہار گل میں ہے طاؤس آتش باز کا عالم

چمن میں پھول پھولوں میں شرارت بڑھتی جاتی ہے

زمین شعر سے کیونکر اوٹھاؤں میں قلم اپنا
کہ شکل نیشکر اس کی حلاوت بڑھتی جاتی ہے

نظر آتا ہے صحرا صاف بیٹھے بیٹھے زنداں میں
ہوائی موسم گل میں لطافت بڑھتی جاتی ہے

یہاں درگاہ میں ہر روز چلے باندھے جاتے ہیں
وہاں نام خدا ہر ایک منت بڑھتی جاتی ہے

بناؤں کا پھیکا تھا بہار آئی نہ تھی جب تک
مبارک ہو اونھیں مہندی کی رنگت بڑھتی جاتی ہے

بہار آئی ہے کاٹے کھاتی ہے زنجیر زنداں میں
گریباں نے گلا گھونٹا ہے وحشت بڑھتی جاتی ہے

گلے سے میرے وہ خود آبدیدہ ہو کے لپٹے ہیں
خجل میں اگلی باتوں پر ندامت بڑھتی جاتی ہے

مسلمانوں کے اوس کافر ادا سے خون ہوتے ہیں
زمین کربلا کی روز قیمت بڑھتی جاتی ہے

سمجھ کر ہم کو اپنا شیفتہ اللہ رے ناز اون کے
جہاں تک منتیں ہوتی ہیں نخوت بڑھتی جاتی ہے

پتا حیدر کا دو دو دن نہیں ملتا احبا کو
نجانے کس پہ پریرو سے محبت بڑھتی جاتی ہے

۲۰ وله ۲۱۹

بیانِ سوزِ غم کا ہیکھ اک طومار ہوتا ہے
کلیجہ اوس کا پک جاتا ہے جو غمخوار ہوتا ہے
اوسی پر حضرت واعظ کو کچھ اصرار ہوتا ہے
جو افسانہ بعید از عقل و دور از کار ہوتا ہے
دئے جاتے ہو غیروں کو تم ساغر بڑے جاؤ
عنایت مجھ پہ کیوں ہے مجھ سے کیوں اصرار ہوتا ہے
گواہی دیتی ہے چہرہ کی سرخی دیکھ لے ساقی
کہ شرمندہ ترے احسان سے میخوار ہوتا ہے
خطا کرتا نہیں گردوں سے جو تیر قضا آیا
نجانے کس کی جنگی میں کب سوفار ہوتا ہے
ستم کا تیرے میں اے آسماں شکوہ نہیں کرتا
ترے ناوک میں اندازِ نگاہِ یار ہوتا ہے
اوسی دن سے ہوا ہے برق تجلی منتظر تیرا
کہ دیکھا میں نے گلشن میں فروزاں خار ہوتا ہے

تڑپنے لوٹنے کا تھا مزہ عہد جوانی تک
گئی فصل جنوں اب درد دل بیکار ہوتا ہے
مجھے ظل ہما کی آرزو ہرگز نہیں ہوتی
میرے سر پر جب اوس کا سایۂ دیوار ہوتا ہے
مزہ اس راستی پر بھی رہا کرتی ہے کج مجھ سے
شکایت اوس کی کیا ابرو تو پھر خمدار ہوتا ہے
جہاں میں کامیابی ہے کرشمہ جوشش ہمت کا
اگر یہ لہر آجاتی ہے بیڑا پار ہوتا ہے
ہوا اور پھر وہ بھی بیت تیرے خزانے میں
وہ مل جاتا ہے فوراً جو مجھے درکار ہوتا ہے
تجھے دشوار سا دشوار بھی آساں سے آساں ہے
مجھے آسان سے آسان بھی دشوار ہوتا ہے
اگر دنیا سے استغنا ہو مرنا بھی ہے آساں
ہوس ہو گر تو جینا بھی بہت دشوار ہوتا ہے
کھلا یہ رمز تاب آفتاب و شبنمستاں سے
ٹھہر سکتی نہیں آنکھیں ہی جب بیدار ہوتا ہے
گذرگاہ فنا میں یہ تماشا دیکھتا ہوں میں

کہ تھم جاتا ہے گرد دریا رواں کہسار ہوتا ہے

قضا کس آئینہ خانہ میں دوڑاتی ہوئی لائی
بشر کو سانس لینا بھی یہاں دشوار ہوتا ہے

حذر اے آسماں کینا مرادوں کے ستانے سے
اولجھ پڑتا ہے وہ جو زیست سے بیزار ہوتا ہے

صفائے دل کو ساتھ اپنے لئے جاتا ہوں مرقد میں
کہیں اب حشر تک میلا کفن کا تار ہوتا ہے

رسائی چاہتا ہوں نظم اپنی کعبۂ دل تک
تو پہلے سدرۂ بت خانہ پندار ہوتا ہے

۲۱ ۲۲۰

پھنسا دینگے غزالانِ حرم اپنا حرم پہلے
وہ پھینکیں تو کمندِ طرۂ زلفِ رسا پہلے

طبیعت میں کہاں تھا خود پرستی کا مزہ پہلے
بھلا آئینہ کب تھا قبلۂ ناز و ادا پہلے

نہ تھے ہم بیش ازیں آگاہ حالِ عشق بازی سے
نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے

ہوئی ہے صبح کیا جلد آج کی شب جو وہ مہماں ہیں

وہی یہ رات ہے جسکی نہ تھی کچھ انتہا پہلے
بہار آئی ابھی میں نغمۂ بلبل نہیں سنتا
مبارکباد کی دے شیشۂ توبہ صدا پہلے
بہانے کوئی حیلہ نکلے یا ہو عیش کا ساماں
گلے کا ہار ٹوٹے پہلے یا بندِ قبا پہلے
خدا نے خیر کی منہ کیا دکھاتا تیرہ بختی کو
سرِ بالینِ تربت شمع سے آئی ہوا پہلے
شبِ فرقت میں کی اس رشکِ عیسیٰ نے مسیحائی
سحر کی دے گئی مجھ کو خبر بادِ صبا پہلے
مجھے اِک دم نہیں بھولا تصور دستِ رنگیں کا
تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا رنگِ حنا پہلے
تہیا اے جنوں اپنا بھی ہے کوہ و بیاباں کا
چلے ہم بھی نکل جائے وہی یہ کالی گھٹا پہلے
جوابِ فسوں طرازی گیسو اس کا ہے نہ اُس کا ہے
قلم ٹوٹے مرا پہلے کہ موسیٰ کا عصا پہلے
زمیں سے کس طرح احباب کے کہنے سے میں اٹھوں
اوٹھانا چاہیے اوس بے وفا کا نقشِ پا پہلے

اوڑھتی ہے نسیم صبح آنچل روئے روشن سے
چھپا لے مطلع خورشید تاباں کو گھٹا پہلے

انھیں منتا بیوں نے اس کے کوچہ سے نکلوایا
کہ جاتے ہی اوٹھایا پردۂ دولت سرا پہلے

زباں تک بھی پہنچنا ضعف سے دشوار ہے اب تو
نکل جاتی تھی دو دو تیر تک آہِ رسا پہلے

وہ کوٹھے پر چڑھینگے برق و باراں کی تماشے کو
الٰہی غیر کی آنکھوں میں چھا جائے گھٹا پہلے

خضر کیا جانیں کیا لذت ہے مرنے میں حسینوں پر
پشیمانی اوٹھائی پی لیا آب بقا پہلے

برا ہوتا ہے دھڑکا ساتھ والوں کے بچھڑنے کا
کبھی سننے میں آتی تھی نہ فریاد درا پہلے

سما سکتا نہیں اب پیرہن میں حسن روز افزوں
نہ یوں ہر روز ٹوٹا کرتے تھے بند قبا پہلے

شکایت کیسی اولٹی منتیں کرنا پڑیں آخر
یہ شوخی دیکھئے خود ہو گئے ہم سے خفا پہلے

حجاب آئے اُسے کیونکر نہ شبنم کے عوض پہ میں

کسی کی آنکھ پڑتی تھی نہ عید رجا بجا سے پہلے

۲۲۱ ولہ ۱۲

اوڑا کے کاگ شیشہ سے مے گلگوں نکلتی ہے
شرابی جمع ہیں مےخانہ میں ٹوپی اوچھلتی ہے
بہارِ بیکشی آئی چمن کی رت بدلتی ہے
گھٹا مستانہ اوٹھتی ہے ہوا مستانہ چلتی ہے
زِخود رفتہ طبیعت کب سنبھالے سے سنبھلتی ہے
نہ بن آتی ہے ناصح سے نہ کچھ واعظ کی چلتی ہے
یہ کس کی ہے تمنا ہچکیاں لیتی ہے جو دل میں
یہ کس کی آرزو ہے جو کلیجہ کو مسلتی ہے
وہ دیوانہ ہے جو اس فصل میں فصدیں نہ کھلوائے
رگِ ہر شاخ گل سے خون کی ندی اوبلتی ہے
سحر ہوتے ہی دم نکلا غش آتے ہی اجل آئی
کہاں ہوں میں یہ نسیم صبح پنکھا کس کو جھلتی ہے
تمتع ایک کا ہے ایک کے نقصاں سے عالم میں
کہ سایہ پھیلتا جاتا ہے جوں جوں دھوپ ڈھلتی ہے
ہنسا رکھی ہے غم پر زیست کی یہ ہو گیا ثابت

نہ لپکا آہ کا پہونچے گا جب تک سانس چلتی ہے
قرار اک دم نہیں آتا ہے خونِ بے گنہ پی کر
کہ اب تو خود بخود تلوار رہ رہ کر اوگلتی ہے
جہنم کی نہ آنچ آئے گی میخواروں پہ او واعظ
شراب آلودہ ہو جو شے وہ کب آتش میں جلتی ہے
نہ دکھلانا الٰہی ایک آفت ہے شبِ فرقت
نہ جو کاٹے سے کٹتی ہے نہ جو ٹالے سے ٹلتی ہے
یہ اچھا شغلِ وحشت میں نکالا تو نے اے حیدر
گریباں سلنے میں الجھنے سے طبیعت تو بہلتی ہے

۲۱ فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل ۲۲۲

ہے دل کو یہ منظور کہ چھپ جائے نظر سے
گیسو کا ارادہ ہے کہ بڑھ جائے کمر سے
آنکھوں میں جو رہتے تھے وہ اوجھل ہوئے نظر سے
پوچھے یہ کوئی جانے والے کے جگر سے
آتے ہیں مگر برہمی طبع ہے ظاہر
اغماض سے انداز ہی تیور ہی نظر سے
کٹ جاتی ہے آخر شبِ غم ہو کہ شبِ عیش

ہوتی نہیں کچھ رات سوا چار پہر سے
ہر اک حرکت کے لئے اک روز سکوں ہے
رفتارِ فلک کم نہیں پروازِ شرر سے
ہم بھی ہیں کھنچے سر د جو رہتا ہے کشیدہ
سایہ کے بھی طالب نہ ہوئے ایسے شجر سے
میں عکس ہوں اور آئینہ ہے گوشۂ عزلت
صورت نہ دکھاؤں گا جو نکلا کہیں گھر سے
ہو جاتا ہے رخسار کدیور کا وہ نمازہ
گلزار میں جو رنگ ٹپکتا ہے ثمر سے
پائی نہ خبر قافلۂ عمر رواں کی
پھر آئے پلٹ کر یہ مسافر نہ سفر سے
سو عیب تھے مجھ میں نہ رکھا ایک بھی منہ پر
شکوہ مجھے رہ جائیگا یہ اہلِ ہنر سے
انساں وہی انسان ہے جو مشتاق ہوا اس کا
کانوں سے سنا جس کو نہ دیکھا ہو نظر سے
اک دم میں بہارِ شبِ عشرت ہوئی آخر
گل ہو گئیں شمعیں نفسِ بادِ سحر سے

ہے دور میں ساغر کے یہاں جلوۂ خورشید
رندوں کا الگ دائرہ ہے دورِ قمر سے

جانے کا تری بزم سے رستہ نہیں ملتا
یہ بھی نہ رہا یاد کہ آئے تھے کدھر سے

عالم میں سخن فہم کسی کو نہیں پاتا
باتیں میں کیا کرتا ہوں دیوار و در سے

انداز نہ اپنا نگہ مست نے چھوڑا
سو شیشۂ دل چور ہوئے گر کے نظر سے

کچھ وعظ میں شوخی ہے نہ انداز میں گرمی
محروم جو ہے زاہدِ خشک آتشِ تر سے

نکلا ہوں نہ نکلوں گا کبھی کوچے سے تیرے
اوٹھا ہوں نہ اوٹھوں گا کبھی میں ترے در سے

عزلت تری ہم کو بھی پسند آگئی اے سرو
اب ہم نے بھی دامن کو لپیٹا ہے کمر سے

پھر ساغرِ جم ہو تو نظر بھر کے نہ دیکھیں
لبریز کیا جام کو جب خونِ جگر سے

اے نظم اوٹھا زانوئے غم سے نہ ترا سر

نکلا سر خورشید گریبان سحر سے

۲۲۴ — ۲۶

چھائی ہی محبت جو دھواں دھار کسی کی
صورت نظر آتی نہیں جز یار کسی کی

عبرت مجھے ہوتی ہی پلٹنے پہ صدا کے
اک بات اُٹھاتا نہیں کہسار کسی کی

یوں مر کہ نہ یاروں کہ ہو بھاری تن مردہ
یوں جی کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی

اچھی بھی گذر جاتی ہی انسان تو بری بھی
رہ جائیگی آسان نہ دشوار کسی کی

پانسے کی طرح کروٹیں لیتا ہے ستارہ
ہی جیت کسی کی نہ سدا ہار کسی کی

کہتا ہی قلم سجدوں میں جبتک نہ کٹے عمر
کیونکر ہو زباں واقف اسرار کسی کی

مارے ہوئے ہیں عشق کے نرگس ہو کہ گل ہو
زخمی یہ کسی کا ہے وہ بیمار کسی کی

اوس ترک کا کھینچینگے گریباں تہِ محمل
ہاتھ آج کسی کا چلے تلوار کسی کی

سبزہ پہ بکھر جاتا ہے جب سبحہ شبنم
پڑھتا ہے وہ تسبیح لگاتار کسی کی

مرقد ہی پہ بس جاکے تھمے گا فرس عمر
کب ان کو مانے گا یہ رہوار کسی کی

بوسے ترے پیکان کے لیتا ہی کوئی زخم
پہنچی ہے ہنسی تا لب سوفار کسی کی

تڑپا گیا دل کو مرے بجلی کا تڑپنا
دکھلا گئی جھلکی مجھے ہر بار کسی کی

گرجی ہوئی دیوار ہی زنداں کی ہماری
زنجیر میں دیکھی ہے یہ جھنکار کسی کی

مرقد وہ جگہ ہے کہ اوتر جاتا ہی سر سے
تاج اس میں کسی کا ہو کہ دستار کسی کی

بسمل ہوا جاتا ہوں تڑپتا نہیں لیکن
تڑپوں گا جو خالی گئی تلوار کسی کی

واعظ ہو کہ ناصح ہو یہ ہے فصل بہاری
ہم رند اوٹھائیں گے نہ زنہار کسی کی

١

کچھ پاس ہے تم کو نہ فلک کو نہ اجل کو — آنکھوں میں مروت نہیں ہے یار کسی کی

دل سے وہ باتیں میں کیا کرتا ہوں پہروں — کیا دل میں اتر جاتی ہے گفتار کسی کی

کانٹوں میں گلا ہو نہ گردن پہ چلے تیغ — تقدیر سے چلتی نہیں زنہار کسی کی

پامال کرے شوق سے مجھ کو سر محشر — سیکھی ہے قیامت نے جو رفتار کسی کی

وہ رشک مسیحا نہیں آتا تو چلے ہم — دیکھے گا نہ اب راہ یہ بیمار کسی کی

چھپ چھپ کے بھی دیکھوں تو چھپی جاتی ہیں نظریں — اتنی بھی نہ ہو طاقت دیدار کسی کی

تم غیر سے ملنے کو کرتی تو ہو لیکن — بھولے سے قسم کھائی ہے سو بار کسی کی

کیا ضبط محبت نے گلا گھونٹ کے مارا — فریاد تھی جیسے کہ گنہگار کسی کی

ہیں پاؤں پہ گرتا ہوں اٹھ اے فتنہ محشر — ملتی ہے تری چال سے رفتار کسی کی

رعشہ سا نظر آتا ہے شاخ گل تر میں — لڑنے پہ کلائی جو ہے تیار کسی کی

٢٢٤ —— ولہ —— ٢

کیا عاشق ناشاد کو وہ شاد کریں گے — آئیگا اگر رحم تو بیداد کریں گے

یہ تیرا آستانا بھی بہت یاد کریں گے — ماتم ترا برسوں دل ناشاد کریں گے

جب وہ کوئی طرز ستم ایجاد کریں گے — یاد آؤنگا میں مجھکو بہت یاد کریں گے

رہ جائیگی بات اور نکل جائیگا پیالہ — اے پیر مغاں ہم تجھے کیا یاد کریں گے

٢٢٥ —— مفعول مفاعیلن دو بار —— ١٨

یہ ذوقِ تماشا کا حاصل نظر آتا ہے
اندھیر ابے آنکھوں سے تا دل نظر آتا ہے

تو آپ ہی اپنے میں حائل نظر آتا ہے
اور آپ کو پا جانا مشکل نظر آتا ہے

عالم میں گراں بار یہ پس دل نظر آتا ہے
پلہ یہ ترازو کا مائل نظر آتا ہے

جلدی سے بہو بختی کی مجھکو در جاناں تک
ایک ایک قدم اب تو منزل نظر آتا ہے

گرداب سے بڑہ ہی کشتی کو بچا کر چل
کترا کے نکلنے میں ساحل نظر آتا ہے

اے ذوق نوا بھی چھیڑی ہے چھیڑی تو نے
طوطی پس آئینہ بلبل نظر آتا ہے

بس ایک ہی پرتو کا سارا یہ کرشمہ ہے
اب آئینہ خانہ بھی محفل نظر آتا ہے

دے آئینہ دل کو پرواز کدورت سے
اندیشہ خود بینی باطل نظر آتا ہے

کشتی ہو جو طوفانی اوس وقت خدا کو
منجدھار سے تے کرنا ساحل نظر آتا ہے

بیدردی خدا سے ڈر توڑ اسکو نہ اے گلچیں
مجھکو تو سر اک غنچہ ایک دل نظر آتا ہے

بس نام ہی نام اب تو سنتے ہیں محبت کا
اس لفظ کا بھی کوئی محمل نظر آتا ہے

گنجینۂ معنی ہے ضائع نہ کر اس دل کو
اب اس میں دو عالم کا حاصل نظر آتا ہے

حسن اور محبت کا لازم ہے نہاں رہنا
کب جان نمایاں ہے کب دل نظر آتا ہے

گر در رم آہو ہے یا رنگ پریدہ ہے
جو خود سے لے کر تا محمل نظر آتا ہے

یا رب یہ سویدا ہے کس کے دل پر خوں کا
برگ گل لالہ میں جو تل نظر آتا ہے

کشتی کو لگا دے پار اے باد مراد آکر
آغوش کو پھیلائے ساحل نظر آتا ہے

تھا جب ہی وہی انساں تو ظالم و جاہل بھی
جو بار امانت کا حامل نظر آتا ہے

یا الٰہی سخن گو سب اک نظم میں ہیں دل
اس بزم میں تو لیکن بیدل نظر آتا ہے

۲۲۶ —— فعلاتن مفاعلن فعلات —— ۱۹

ہوں جو مہمان رات بھر کے لئے — حشر برپا کریں سحر کے لئے
سوزِ دل کیا بجھے کہ آپ آئے — آگ لینے کو لمحہ بھر کے لئے
جتنے عشوے تھے چشم ساقی میں — اوتنے ساغر حباب کر کے لئے
تیری زینت گہر سے کیا ہو گی — آبرو ہو گئی گہر کے لئے
پہلے جو دامن و گریباں تھا — اب ہے رومال چشم تر کے لئے
پہلے ہاتھوں سے تھامتا تھا جگر — ہاتھ ملتا ہوں اب جگر کے لئے
دمِ رفتار حشر نے اُبھر کر — قدم اس شوخ فتنہ گر کے لئے
کیوں لگائی ہے ڈاب کافی تھا — ایک چھلا تری کمر کے لئے
نزع میں میں نے ہر طرف دیکھا — آپ آئے نہ لمحہ بھر کے لئے
ہم تو سمجھے تھے زیست ہی کو عذاب — لاکھ ہیں آفتیں بشر کے لئے
عرش کے کنگروں پہ نالوں نے — ٹھوکریں کھائی ہیں اثر کے لئے
زاہد آئے جو بزم میں ساقی — رہنے دینا نظر گذر کے لئے
سر کو رکھے ہوں خاک در پہ ترے — کہ یہ صندل ہے درد سر کے لئے
کیا غضب ہو گیا اگر دیکھا — دل تڑپتا تھا اک نظر کے لئے

نگہ التفات جس کی ہو	اوس کا بندہ ہوں عمر بھر کے لئے
موت کا ڈر تو کچھ نہیں لیکن	زادِ رہ چاہیئے سفر کے لئے
بے سر و پا جو ہو کرے کیا فکر	پاؤں کے واسطے کہ سر کے لئے
کبھی کھلنا کلی کو ہو نہ نصیب	بند مٹھی رہے جو زر کے لئے

ہجر کی رات ہے یہ رات اے نظمؔ
منتیں مانئے سحر کے لئے

۲۲۷ ——— وله ——— ۱۵

راز افشا کہیں نہ ہو جائے	فتنہ برپا کہیں نہ ہو جائے
حبِ دنیا کہیں نہ ہو جائے	دیکھ سودا کہیں نہ ہو جائے
کون واعظ کے منہ لگے جا کر	مفت جھگڑا کہیں نہ ہو جائے
خون دل آتے آتے اشکوں میں	تھوڑا تھوڑا کہیں نہ ہو جائے
دیکھ لے آنکھ بھر کے دنیا کو	یہ تماشا کہیں نہ ہو جائے
خواب مرقد میں بھی یہ دھڑکا ہے	حشر برپا کہیں نہ ہو جائے
ضبط نالے نہ کر دلِ بیمار	درد پیدا کہیں نہ ہو جائے
بڑھتے بڑھتے یہ کاکلِ شب رنگ	شبِ یلدا کہیں نہ ہو جائے
ناز کو ہے خیال پردہ دری	کوئی رسوا کہیں نہ ہو جائے
نہ لبِ بام مجھ کو زلواؤ	لبِ دریا کہیں نہ ہو جائے

پھر نہ چہرے پہ چھوڑیئے زلفیں | پھر اندھیرا کہیں نہ ہو جائے
شام ہی سے سحر کا ذکر نہ کر | دل کو دھڑکا کہیں نہ ہو جائے
دل پر سوز پر نہ رکھو ہاتھ | ید بیضا کہیں نہ ہو جائے
صاف ہے چاندنی نہ اٹھو نقاب | چاند دھبا کہیں نہ ہو جائے

استادعویٰ نیاز کا اے نظم
ناز بیجا کہیں نہ ہو جائے

۲۲۸ — ولہ — ۱۳

طرز دکھلا دے اوس کی قامت کے | پاؤں پڑتا ہوں میں قیامت کے
دن نہ گنئے اگر مصیبت کے | ہم تھے مہمان چند ساعت کے
میرا ساغر رہا نہیں خالی | صدقہ ہو جاؤں اس کی رحمت کے
دل لگا کر کوئی سنے تو کہوں | جو فسانے ہیں دل کی حسرت کے
وقت پر تم نے لی خبر ورنہ | مر گئے ہوتے ہم تو مدت کے
گر نہیں ہے ریا تو رندوں میں | ہیں یہ آثار اہل جنت کے
مشت خاک اور ہما ہمی اتنی | کارخانے ہیں تیری قدرت کے
اے صبا تذکرہ وطن کا نہ کر | رہنے والوں سے دشت غربت کے
فاتحہ پڑھ کے لی جو ٹھنڈی سانس | جھلملائے چراغ تربت کے
کھل گیا راز دل نہ مدفن پر | پھول نکلے جگر کی رنگت کے

آدمی آدمی کے کام آئے | یہی معنی ہیں آدمیت کے
حشر پر رکھا وعدۂ دیدار | یہ کنائے ہیں کس قیامت کے

اپنے مذہب میں ہے یہی توحید
نظم بندہ ہیں ہم محبت کے

٢٢٩ ——— فعولن چار بار ——— ١٢

جو نالے لب پیر کنعاں سے نکلے | لئے ساتھ یوسف کو زنداں سے نکلے
اجل پر ہی تہمت قضا پر ہے بہتاں | یہ سب شعبدے چشم فتاں سے نکلے
وہ نازک طبیعت ہے نامہ ہوا ایسا | کہ طومار مضمون عنواں سے نکلے
اُتر آئے وہ پیچ سب میرے دل میں | جو کافر کی زلف پریشاں سے نکلے
کسی کو غش آجائے وقت نظارہ | ہوا بھی نہ ظالم کے داماں سے نکلے
عنادل کریں جب ہزاروں ہی نالے | تو اک آہ لبہائے خنداں سے نکلے
کھلا مجھ پہ واعظ کا زہد ریائی | یہ حضرت بھی کچھ نامسلماں سے نکلے
جنھیں رند بے باک سمجھا تھا زاہد | وہی لوگ کچھ اہل عرفاں سے نکلے

ق

کبھی ابر کے ساتھ پھرتے تھے ہم بھی | خیاباں میں پہونچے بیاباں سے نکلے
چھڑاتے ہوئے شاخ گلبن سے دامن | اور بچتے ہوئے سنبلستاں سے نکلے
کبھی گل کے رخسار پر منہ کو رکھا | کبھی جھٹکے سرو گلستاں سے نکلے
غرض یہ کہ بزم خرابات میں بھی | گئے اور ہو کر پشیماں سے نکلے

۲۰

اثر گوش گل تک رسا ہو گئی
مری نامہ بباب صبا ہو گئی
یہ تھی فرصت عمر یا شمع تھی
زبس حکم برہم کہا اس نے کن
سیاہوں سے رندوں کے ظلمت جو تھی
کہ رو قافلہ تک پہنچنے میں کد
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
ہے آپس میں اب تو عناد و نفاق
گری تھی ابھی برق منکر نگاہ
نظر کا نظر سے ملانا نہ تھا
زیادہ تمنا بھی اچھی نہیں
ہوئی ہاتھ ملتے ہی ملتے ملعف

۱۲

تو شبنم در بے بہا ہو گئی
ابھی آئی تھی پھر ہوا ہو گئی
ذرا جھلملائی فنا ہو گئی
عیاں خصلت پارسا ہو گئی
سمٹ کر وہ کالی گھٹا ہو گئی
بہت دور بانگ درا ہو گئی
غضب ہے جو غفلت ذرا ہو گئی
محبت وہ اگلی ہی کیا ہو گئی
اوٹھی گر کے تیغ قضا ہو گئی
لڑائی کی اس پر بنا ہو گئی
اجل آتے آتے خفا ہو گئی
جوانی تو رنگ حنا ہو گئی

۲۳۱ — فاعیل مفاعلن مفاعیل — ۱۰

بدعت مسنون ہو گئی ہے
امت مطعون ہو گئی ہے
کیا کہنا تری دعا کا زاہد
گردوں کا ستون ہو گئی ہے
رہنے دو اجل جو گھات میں ہے
مجھ پر مفتون ہو گئی ہے

حسرت کو غبار دل میں ڈھونڈو | زندہ مدفون ہو گئی ہے
وحشت کا تھا نام اوّل اوّل | اب تو وہ جنون ہو گئی ہے
واعظ نے بری نظر سے دیکھا | مے شیشہ میں خون ہو گئی ہے
عارض کے قرین گلاب کا پھول | ہم رنگ کی دون ہو گئی ہے
مل کر دیو و ملک کی سیرت | طرفہ معجون ہو گئی ہے
بندہ ہوں ترا زبان شیریں | دنیا ممنون ہو گئی ہے

حیدر شب غم میں مرگ ناگاہ
شادی کا شگون ہو گئی ہے

۲۲ —— تضمین دعائیہ —— ۱۴

فلک مطیع رہے بخت سازوار رہے | اساس دولت و اقبال پائدار رہے
یہ اوج منزلت و جاہ برقرار رہے | ہمیشہ خلق میں عثماں ترا وقار رہے
نبی کا لطف رہے فضل کردگار رہے

فروغ مہر پہ چمک کر نگین دکن | چمک سے جس کی فروزندہ ہو جبین دکن
فلک پہ سنبلہ ہو جائے خوشہ چین دکن | عروج پائے ترے دم سے سرزمین دکن
ترے قدم کا سر آسمان غبار رہے

اسی طرح سے رہے اوج موج شوکت میں | اسی طرح سے رہے ابر بہر دولت میں
یونہی نسیم طرب گل فشاں ہو صحبت میں | خزاں نہ آئے کبھی تیرے باغ عشرت میں

خدا کرے کہ ہمیشہ یہی بہار رہے

ہمیشہ سایہ رہے تیرا ملک و ملت پر | ہمیشہ دست عطا زر فشاں رعیت پر
کرم کی شان رہے اس عروج و رفعت پر | نگاہ لطف رہے وابستگان دولت پر
یہ باہمی جو تعلق ہے خوشگوار رہے

رہے جہاں میں تو حامی دین و دولت داد | رہے خزانہ زر افشاں ہمیشہ ملک آباد
رہے زمانہ میں سرسبز تیرا باغ مراد | رہے نہال ترے سایہ میں تری اولاد
تری امید کا ہر نخل بر قرار رہے

جو خیر خواہ کے حق میں کرم ہے رشک سحاب | نگاہ قہر بد اندیش کو ہے برق عتاب
نہ مثل تیرے کرم کا نہ ہے ستم کا جواب | بہ رنگ گل تر و تازہ رہیں ترے احباب
مثال زخم عدو تیرا دل فگار رہے

رہے مدام درخشندہ اختر طالع | کہ خیر خواہ کریں شکر نعمت صانع
یہ عرض نظم کی ہے جو ہے بندۂ تابع | دعا ہماری یہ دل سے ہے آصف سابع
مدام ملک دکن کا تو تاجدار رہے

۲۳۲ غزل و قصیدہ بہ بحر خسروی ۱۳ش

دزدیدہ نگاہیکہ بہ تیر قضا داشت | دل از کف من برد و جفا کرد و روا داشت
در دیدہ و دل شوق فراوان تو جا داشت | این ذوق جفا داشت و آن چشم وفا داشت
دل تنہا نہ غم داشت و آن طرفہ رفو سما داشت | وہم است ترا این کہ بہ پہلوی تو جا داشت

هر چند که گردون همه جور و جفا داشت — از فکر بیاسود دل من که خدا داشت
تا عکس خود افگند بشوخی و روان شد — آئینهٔ او حیرت نقش کف پا داشت
در دست حنا بستهٔ او دزد حنا بود — این دزد ندانم ید بیضا ز کجا داشت
خون ریختی و عربده ها کردی و شادم — دانم که بریں کار ترا ناز و ادا داشت
چون قافلهٔ بیم خرد و هوش روان شد — رنگیکه پرید از رخ من بانگ درا داشت
فریاد ازیں عاقبت طالب دنیا — میرفت بسوئے عدم و رو بقفا داشت
آں طائر ناداں که بقید قفس آمد — بیچاره ندانست که در پیش چها داشت
دل دوخت به ناوک کشش سرمهٔ جادو — دنبالهٔ او ره ز کجا تا بکجا داشت
در دولت این خسرو عادل عجب اینست — دیدم صف مژگاں که دو صد فتنه بپا داشت
برجستم و این مطلع برجسته بخواندم — پیش شه ذیشاں که لقب ظل خدا داشت

۲۳۴ ——— (مطلع) ——— ۱۱

صد لطف بهر عاجز و مسکین شه ما داشت — شه دست کرم داد و او دست دعا داشت
هنگام تکلم لب لعلش گهر افشاند — هر گوهر غلطاں بگره آب بقا داشت
صد نکته فزود است به دیوان سیاست — صد عقده کشود است بفکری که رسا داشت
آوازه شنیدیم و دویدیم بسویش — سنگ در او منزلت کوه صفا داشت
تا رایت اقبال تو بر اوج ظفر تافت — افشاند براهش پر و بالی که هما داشت
تا عدل شهی مژده امنی بجهاں داد — تائب شده گردوں که سر جور و جفا داشت

از نکہتش ملک دکن تازہ جواں شد
شمشیر و قلم داد بہ پیرے کہ عصا داشت

با معدلتش دست ضیعفاں بہ گرفت
و یدیم پر کاہ کشش کاہربا داشت

تا از نفحت باد بہاری بوزیدست
گلزار دکن از سر نو منشو و نما داشت

بدخواہ تو گشت است چناں عاجز و رسوا
دیدند کہ او پایہ گل بر سر ہوا داشت

صدبار دم از ناز و تفاخر بزند نظم
بارے بہ صف حاشیہ بوسان تو جا داشت

۷ (نظام گزٹ سے منقول ہوا)

۲۴۵ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اپنے پروردگار کی نعمت کا ذکر کرا
اعلیٰ حضرت ظل اللہ کا وجود ذی جود ایسی نعمت ہے جس کی
تاریخ اوراق روزگار و صفحات قلوب پر ابد آلاباد تک نقش رہے گی
جس کی نعمتوں کی برکتوں کا شمار و احصاء زبان و قلم کے حیطۂ امکان
سے باہر ہے یہ ترانہ سالگرہ بامتثال امر باری زبان قلم پر جاری
ہوا۔

آٹھ معین قافیوں میں سات شعر کی قید تھی

(امید یار جنگ سید علی حیدر نظم طباطبائی)

جوش گل جوش طرب جوش بہار است اینجا
گل فشاں نغمہ زمنقار ہزار است اینجا

از چراغان شدہ ہر کوچۂ و برزن پر نور
کہکشاں جادہ بہ ... زارست اینجا
شعلۂ ورشتۂ شمع ست بہم پیوستہ
تاج زریں ز طرب بر سر خارست اینجا
من کہ در ظل خداوند خدا می بینم
چشم بر ہم زنم جلوۂ یارست اینجا
شام یک مژدۂ امن ست و سحر مژدۂ عیش
ہر دو یک اند مگو لیل و نہارست اینجا
شب این جشن و فلک عقد ثریا در دست
یعنی این سلک گہر بہر نثارست اینجا
نغمۂ نظم کجا بار دریں بزم سخا
مجمعے خوش ز امیران کبارست اینجا

۲۳۶ ملمع ۴۲

وارفتۂ حرف حق ہیں اہل توفیق
یہ موعظۂ پیر طریقت سمجھو
حنظل بھی جو ہو تو جانتے ہیں مصری
طبتم اخذتم علیہا اصری

رباعی

سالک کو فروتنی سے کب چارہ ہے
سالک وہ نہیں جو محو نظارہ ہے

دیکھو آنکھیں جو دونوں تیچی کر لیں | پہلے جو ستارہ تھا وہ سیارہ ہے

رباعی

آئینہ سے نیک نام اسکندر ہے | آئینہ جڑا ہوا انگوٹھی پر ہے
نام اس کا اسی نگینہ پر ہے کندہ | شاہی کا نگیں ہے نہ اب انگشتر ہے

رباعی

جو ظلم کئے تھے وہ ذرا سہہ تو سہی | انصاف خدا کے ہاتھ ہے یہ تو سہی
مظلوم بھی ہے داورِ محشر بھی ہے | ظالم نطقاً و سیفاً اب کہہ تو سہی

رباعی

جو معنی برجستہ ہیں سب بندھتی ہیں | جب بندھتی ہیں مضمون عجب بندھتی ہیں
ہیں کم سخن اس سے ہوں گو شیریں ہی کلام | کھلتی ہے اگر زبان تو لب بندھتی ہیں

رباعی

دل کی حرکت کو اضطراری سمجھو | یہ طائرِ جاں کی بیقراری سمجھو
ہے عمرِ بشر چند نفس کی میعاد | جینے کو فقط نفس شماری سمجھو

رباعی

دنیا اک ہولناک ویرانہ ہے | اور طولِ امل فسون و افسانہ ہے
لالچ سے حذر چاہیئے غصہ سے گریز | وہ خوک ہے اور یہ سگِ دیوانہ ہے

رباعی

رباعی

افلاس میں اسلاف کی عزت تو ہے | زر ہائے گرگلوں میں نکہت تو ہے
ہر حال میں اخلاق کریمانہ رکھو | دولت تو نہیں رہی شرافت تو ہے

رباعی

دعویٰ ہم کو یہ ہے کہ لائق ہم ہیں | بے علم و کمال سب پہ فائق ہم ہیں
کہتی ہے مگر ہماری تن آسانی | خود اپنے لئے مانع و عائق ہم ہیں

رباعی

سودا ہے ہزار طرح کا سر ہے ایک | خطرے لاکھوں ہیں اور خاطر ہے ایک
حرص۔ آز حسد عُجب غضب جہل ہوس | سات رہزن ہیں اور مسافر ہے ایک

رباعی

ظاہر میں تو خاطریں مداراتیں ہیں | دل میں بیٹھا ہی چور اور گھاتیں ہیں
باقی نہیں ہم میں اتفاق کلمہ | جتنے منہ ہیں بس اتنی ہی باتیں ہیں

رباعی

کچھ دخل کوئی فہم کو دیتا ہی نہیں | اب تک نافہمیوں سے چھٹتا ہی نہیں
ہر بات ہی تیری میری دیکھا دیکھی | اب عقل سے کوئی کام لیتا ہی نہیں

رباعی

غافل ہیں ہمیں فکر پس و پیش نہیں | یعنی کہ مقدّر میں کم و بیش نہیں

سو مرتبہ حادثوں نے کھولی ہے آنکھ　　اب بھی نظر عاقبت اندیش نہیں

رباعی

ایسا بھی کہیں حد سے گذر جاتے ہیں　　جو دل میں آگئی وہ کر جاتے ہیں
اچھے نہیں اطوار ہمارے اے نظم　　لوگ ایسے ہی جوان مر جاتے ہیں

رباعی

دریا میں ہوں اور اہل نظر پیاسا ہوں　　پہلے سے بھی اب تو بیشتر پیاسا ہوں
سچ کہتے ہیں آبِ شور ہے یہ دنیا　　میں ڈوب کے مر گیا مگر پیاسا ہوں

رباعی

ہر عضو بدن نزع میں گھل جائے گا　　یہ جسم کہیں خاک میں مل جائے گا
تا زیست تو کی ہے پردہ داری ہم نے　　مرقد میں مگر خضاب کھل جائے گا

رباعی

میں تا لبِ گور عمر بھر میں آیا　　دم میرا لبوں پہ اس سفر میں آیا
اس طرح سے پیری نے مروڑا مجھکو　　جو زلف میں خم تھا وہ کمر میں آیا

رباعی

جس کو نہ غم مآل اصلا ہوگا　　پھر خاک اسے اندیشۂ فردا ہوگا
کیفیت حال میں ہر اک شخص ہے مست　　یہ فکر نہیں کسی کو اب کیا ہوگا

رباعی

گو اب نہیں مال و جاہ و دولت باقی	باقی ہے خدا اور اس کی رحمت باقی
سو مرتبہ ہو جائے زوالِ نعمت	سب کچھ باقی ہے گر ہے ہمت باقی

رباعی

کیوں سو رہے جا کے گور کی منزل میں	خالی تھی جگہ ان کے لئے تو دل میں
کچھ شعر لکھے تھے وہ سنائے اے نظمؔ	افسوس کہ میکش نہیں اس محفل میں

تاریخیں

تہنیت عقد ثانی اعلحضرت خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

ہے آج جشن کہ سرکار عقد میں لائے	عروس آئینہ رخسار و ماہ سیما کو
زہے شکوہ سلیماں کو مل گئی بلقیس	زہے فروغ کہ یوسف ملا زلیخا کو
تو جا کے بزم میں اے نظمؔ عقد کی تاریخ	یہ عرض کر کہ مبارک حضور والا کو
	(۱۳۴۱ھ)

تاریخ تعمیر کتب خانہ آصفیہ

بنا نمود کتب خانہ آصف ہفتم	رساند ذروۂ اعلیٰ بہ اوج مریخش
نوشت نظمؔ دعا گو چو دید بنائش	کہ ہٰذہ الکتب القیمہ ست تاریخش
	(۱۳۴۹ھ)

تاریخ ترجمہ وکار آف ویکفیلڈ

ترجمہ اردو میں انگریزی فسانہ کا ہوا	واقعی باتیں لباسِ داستاں پہنے ہوئے

ایک مصرع میں ہوئی تقریظ بھی تاریخ بھی — ہے فرنگن زیورِ ہندوستان پہنے ہوئے
(۱۳۰۲ھ)

تاریخ طبع دیوان میرزا ذاکر حسین یاس مرحوم

ہر شعر سے حسن خوش بیانی نکلے — ہر لفظ سے لطف نکتہ دانی نکلے
اے نظم چھپے نہیں یہ اشعار تمام — پتھر سے چشمۂ معانی نکلے
(۱۳۰۶ھ)

تاریخ ولادت نواب شہنواز جنگ بہادر

کیا ستارہ سا پسر حق نے دیا — حسن میں ہے غیرتِ ناہید یہ
دایہ سے حیرت میں ہاتف نے کہا — آگیا ہے گود میں خورشید یہ
(۱۳۱۲ھ)

تاریخ مثنوی ضیائے دکن

جناب مولوی باقر حسن نے — لکھے کیا پُر ضیا و روشن اشعار
مضامین انکے سب ہیں دُرِ غلطاں — قلم کا ہے سوادِ ابرِ گہر بار
یہ شیرازہ ہے یا موتی گندھے ہیں — خجل ہے عقدِ مروارید کا تار
ہوا ہے نظم یہ مصراع تاریخ — یہ سب اشعار ہیں لولوی شہوار
(۱۳۰۸ھ)

تاریخ دیوان حبیب کنتوری مرحوم

چھپ گیا کیا خوب دیوان حبیب — سب سخنور محوِ نظارہ ہوئے
نظم میں نے طبع کے گن کر سنین — لکھ دیا تیرہ سے اٹھارہ ہوئے
(۱۳۱۸ھ)

تاریخ دیوان نواب نبو صاحب رفعت مرحوم

فکر رفعت کی بلند اور طبیعت رنگین — کہنا اس طرح ہے قابو میں جسے کہتے ہیں

اونکے دیوان کی تاریخ یہ لکھی میں نے | سحر ایسا ہو اس اردو میں جسے کہتے ہیں
(۱۳۰۰ھ)

مجھے ہمیشہ سے تاریخ کہنے سے انکار ہے تاریخ فن شعر میں داخل نہیں ہے مگر مجبور ہو کر کہہ بھی لیتا ہوں نواب عزیز یار جنگ بہادر مرزا داغ مرحوم کے ایک خوش فکر شاگرد ہیں میرے پاس آئے اور اپنے دیوان کی تاریخ کہنے کے لیے مجبور کیا میں نے یہ مصرع کہا:۔

"داغ کا انداز اس دیوان میں ہے"
(۱۳۲۶ھ)

تاریخ وفات نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم

بسکہ ہے آبستن[۱] موت و حیات | حیف یہ عبرت کدۂ ایرماں[۲]
جو کوئی اس دار فنا سے گیا | پھر کے نہ آیا وہ کبھی پھر یہاں
اوٹھ گیا اس بزم سے حیف ایک امیر | باذل و ذی رتبہ و والا مکاں
رہ گیا نیکی کا زمانہ میں ذکر | مٹ گیا ایثار و کرم کا نشاں
غم سے برا حال ہے احباب کا | درد و الم دل میں ہے لب پر فغاں
نام بھی مرحوم کا تاریخ بھی | ہیں اسی اک بیت سے دونوں عیاں

معتمد الدولہ بہادر نے ہائے
کوچ کیا سوئے نعیم جناں
(۱۳۲۸ھ)

۱؎ آبستن بمعنی حاملہ ۲؎ ایرمان بمعنی عاریت ۱۲

تاریخ وفات علی فرزند سید محمد تقی صاحب

ماں باپ کی آنکھوں میں تھی تیرہ و تاریک
ذی الحجہ کی تیرھویں یہ رحلت سے علی کی
افسوس کہ بس اک سال اور آٹھ مہینے
کیا گھر میں اُجالا تھا طلعت سے علی کی
اس واقعہ کی اے نظم فصلی ہے یہ تاریخ
اندھیرے دنیا میں فرقت سے علی کی
(۱۲۴۰) - (۱۱۰۹)

تاریخ وفات استاذ علامہ جناب قائمۃ الدین رحمہ اللہ تعالیٰ

مَاتَ الفقیہُ الالمعُی المقتدیٰ
وقد استباح الکنز مِنْ عُلیا التقیٰ
مذلم یزل للذین قائمۃ و رکن
للھدایۃ والزمان بہ اقتدیٰ
فنجوم اوجاتِ الشریعۃ قدھوت
وَسِرَاجُ اَنوارِ الھدایۃ قدَخبیٰ
اَرَّخْتُ عام الارتحالِ بمصرعٍ
لتزلزلت واللہِ ارکان الھدیٰ
(۱۲۹۸ھ)

تاریخ وفات سید بلگرامی مرحوم

ہوش نے رامپور سے لکھا ۔ کہ ہے رنج و غم و الم کا ہجوم
ان کے والد نے انتقال کیا ۔ اور تاریخ میں کروں مرقوم
پڑھ کے خط میں نے کہہ دیا دوبار ۔ سید بلگرامی مرحوم

سہرا بتقریب عروسی آغا سید حسن اطال اللہ عمرہ

سر پہ نوشہ کے جو ہے دُرِ عدن کا سہرا ۔ عکس سے لب کے بنا لعلِ یمن کا سہرا
سر پہ آنچل جو پڑا ہو گیا دونا جلوہ ۔ کہ ہے سہرا یہ دوپٹہ کی کرن کا سہرا
گوہرِ شہوار چمکتے ہیں ستاروں کی طرح ۔ موتیوں کا ہے کہ پروین و پرن کا سہرا
چشمکیں کرتا ہے مہر مہ پہ ستاروں کی کبھی ۔ اور کبھی رنگ اُڑاتا ہے چمن کا سہرا
سب پڑھیں سورۂ اخلاص کی جا سورۂ طور ۔ اک تجلی ہے رخِ جلوہ فگن کا سہرا
کیا چمک طرۂ دستار پہ نوشہ کے ہے ۔ جس سے شرما گیا گھونگٹ میں دلہن کا سہرا
یہ تجلی کسی نوشہ میں نہ دیکھی ہوگی ۔ سر پہ خورشید کے جب ہے کرن کا سہرا
آئینہ بیچ میں دیکھا کیا یہ راز و نیاز ۔ اولجھا نوشاہ کے طرہ میں دلہن کا سہرا
گلِ عارض کی صباحت کا مسلسل ہو جو ذکر ۔ یہ غزل ہے گلِ نسرین و سمن کا سہرا
بارور تو نے کیا نخلِ تمنا یا رب ۔ تو نے دکھلا دیا اس رشکِ چمن کا سہرا
جوہری نے بھی نئی اصطلاح پہ ٹوٹے موتی ۔ جس طرح نظم نے لکھا ہے حسن کا سہرا

عبارت خاتمہ

یہ سب غزلیں مشاعروں کی ہیں یا گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض بعض احباب کی فرمائشی زمینوں میں ہیں میں خود سے کبھی غزل نہیں کہتا۔ ردیفیں پوری نہیں ہیں اور الف بے کا پورا کرنا میں ہمیشہ سے فضول سمجھتا ہوں غزل میں مقطع کا ہونا نہ ہونا میرے نزدیک یکساں ہے دیوان برسوں سے مرتب ہو چکا تھا مگر چھپنے کا وقت اب آیا میں نے پھر سرے سے آخر تک ایک نظر ان غزلوں پر ڈالی اور اکثر مقاموں میں تغیر و تبدیل بھی کی ہے۔ میری اردو بھی فارسی سے کم نہیں ہے میں نے فارسی کی طرحوں میں جو غزلیں کہی تھیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیں ان غزلوں میں جا بجا معشوقانہ اداؤں کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں۔

خدا زاہد پرست و رہبان منش لوگوں کی نظر بد سے اس نگارستان معانی کو بچائے!

حور مقصورات فی الخیام کا نھن اللولو المکنون

جعلنا من ابکاراً عرباً اترابا

ڈیروں میں رہنے والی غزال چشم عورتیں (اعرابیہ بدویہ)
گویا کہ وہ در مکنون ہیں ہم نے ان کو کواری چاہنے والی سہیلیاں بنایا
ہے۔

علی حیدر طباطبائی

کتبہ محمد عبد الستار کاتب مکتبہ ابراہیمیہ

چند علمی کتابیں

مقدماتِ عبدالحق

مولوی عبدالحق صاحب بی اے (علیگ) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ و معتمد انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کو مقدمہ نویسی و دیباچہ نگاری میں جو شہرت حاصل ہے وہ کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ یہ مولانا کے کل مقدمات کا ایک بیش بہا گراں قدر اور نایاب مجموعہ ہے جس میں مذہب، فلسفہ، تاریخ و تذکرہ، زبان و ادب مختلف موضوعات پر وہ عالمانہ اور بسیط مقدمے ہیں جو اردو زبان کی متعدد و بلند پایہ کتابوں کے ساتھ ہیں اور جو بجائے خود بھی اپنے موضوع پر فاضلانہ مقالے ہیں۔ قیمت حصہ اول (سے) حصہ دوم (عاں)

مثنویاتِ میر

مرتبہ مولوی سید محمد ایم اے۔ یہ اردو شاعری کے سرتاج میر تقی میر کی جملہ مثنویات کا مجموعہ ہے جو متعدد قلمی نسخوں کے باہمی مقابلے اور بڑی تحقیق و تلاش کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ مثنویاں اپنی اعلیٰ شعریت کی وجہ سے اردو ادب میں شاہکار ہیں۔ مثنویات میر جامعہ عثمانیہ کے امتحان ایم اے اور دوسری جامعات کے اعلیٰ اردو نصاب میں شریک ہیں۔ لائق مرتب نے بڑی صحت کے ساتھ مثنویاں ترتیب دینے کے علاوہ ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے اور میر صاحب کی سوانح حیات ان کے کارناموں اور مثنویات پر بلند پایہ تعمیری تنقید بھی کی گئی ہے

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

غلطنامہ "صوتِ تغزل"

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۴	فردوبشر	فردِ بشر
۴	۸	قیامت	قیامت
"	۱۲	سرخد	سرمد
"	۱۴	موبد	موبد
"	آخری خفی	(دوانگلیاں	دو انگلیاں
	پہلی سطر " دوسری	(لغت میں مویدد ونی طرح	لغت میں مؤید دونوں طرح
۵	۱۵	تعالی اللہ	تعالی اللہ
۶	۳	کہاں ہے	کہاں ہے
"	آخری خفی سطر	[illegible]	[illegible]

۱۴	۱۰	اس قدر لی چٹکیاں	اس قدر لیں چٹکیاں
۱۵	۱	ہوئی الجھن بڑا	ہوئی الجھن بڑھا
۱۷	۷	شُعاع	شعاع
۲۲	۴	دھوت	دھوپ
۲۸	۲	کب اُس	کب اِس
"	۷	(۱۷) ولہ	(۱۷) ولہ ۱۱۹۱
۳۳	۱۲	نہں یک	نہیں اِک
۳۴	۳	ہؤا	ہوا
۳۵	۷	مٹھی	مٹی
۳۹	۱	×	فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات
"	۹	مجھ کو	تجھ کو
"	۱۲	جو یارانہ	جو بارانہ
"	۱۵	دن چڑہا	دِن چڑھا
۴۱	۷	میں	ہیں
۴۳	۱۶	نازہے	نازسے
۴۵	۷	آہوں	آہو
"	۹	ڈھلنا	ڈھلتا

۴۵	۱۳	بھی نہ آئی	بھی آہی
"	۱۷	آئے	آسکے
۴۶	۱۲	مورملخ	مور و ملخ
"	۱۴	حالم وجد	عالم وجد
۴۹	۴	مزا	مزا
"	۷	مغر	مقر
۵۰	۵	ہوگا	ہوگیا
"	۱۴	نطمۂ	لطمۂ
"	۱۵	نے لے	سے خضر لے
۵۱	۱۳	برق رہ گئی	برق بھی رہ گئی
۵۲	۱	گئے	گئے
۵۵	۱۲	شبہ	شبہۂ
"	۱۷	اژدحام	ازدحام
۵۶	۱۲	بہ بزم جلوہ الخ	اگرچہ رخصت الخ
"	۱۳	اگرچہ رخصت الخ	ہوائے ابر الخ
"	۱۴	ہوائے ابر الخ	بہ بزم جلوہ الخ
۵۷	۶	سیما	مسیحا

۵۸	۷	قائل	قابل
"	۱۳	گیارا	گوارا
۵۹	۱۵	مٹھکا	کھٹکا
۶۰	۱۵/۱۶	حیف بندہ	حیف بندہ
۰	۰	حال معلوم	حال ق معلوم
۶۲	۱۴	کو	لو
۶۳	۲	گرہ	گریہ
"	۴	لیا	گیا
۶۵	۱۴	کہ	کے
۶۷	۲	یگاما	لگایا
۷۰	۱۴	مشکے بو	مشک بو
۷۱	۱۴	بھلا	بہلا
۷۲	۵	جوآبا	جواب آیا
۷۶	۴	۳۷	۲۳
"	۸	سرگہ	ہرکہ
۷۷	۱۲	بگزوریم	بجزرم
۷۹	۱	|| ||	|۶۰| |۱۴|

۷۹	۳	عشعش بیامائم	عشقش بیاسائم
"	۸	ہم ست	ہم است
۸۲	۴	لہ	کہ
"	۱۱	میست	نیست
"	۱۶	حکاتے	حکایتے
۸۴	۵	بال وپری	بال پری
"	۱۴	غرض	عرض
۸۵	۴	۱۹	۱۱
۸۶	۱	کیطرح زمیں	کیطرح ولہ زمین
۸۷	۲	دورباش	دورباش
"	۱۱	سوال	سوال
۸۸	۳	مشک وبو	مشک بو
۸۹	۵	کُشتی	کشتی
"	۱۱	صد	پیر
۹۰	۹	دست ویا	دست وپا
"	۱۲	مائم	مائیم
"	"	تا عمر	تابہ عمر

۹۱	۱۵	نفس	نفس امارہ
۹۳	۵	تھی	تھے
〃	〃	حلاحل	جلاجل
۹۶	۷	لعغزش	لغزش
〃	۶	تعزرر	تعزیر
〃	〃	حسینونکے	حسینوں کے
۹۹	۹	پُہرا	پہرا
۹۹	۱۱	ڈھلجاتے	ڈھل جانے
۱۰۰	۵	ہیں	میں
۱۰۰	۶	افسانہ پہ پر	افسانہ پر
۱۰۰	۱۵	یانئیں	یانہیں
۱۰۲	۱۱	پروانہ	پروانوں
۱۰۴	۲	کہ سی	کہ اسے
〃	۶	آگے	آکے
۱۰۵	۱۴	پیرسر	تیر پر
۱۰۶	۱۳	آوازہ	آواز
〃	۴	ارسی	آرسی

۱۰۷	۹	صبرے	صبر نے
۱۱۶	۱	کہیں	کھُلیں
"	۶	گرتاب	گرداب
۱۱۷	۱	ہیں بشر	ہیں ہے بشر
"	۱۷	گرساں لیطرف	گریباں کیطرف
۱۹	۶	ادھر	اُدھر
"	۱۶	چاہ وپیار	چاہ پیار
۱۲۰	۱	برزخ	برزخ
"	"	لکا	رنگا
"	۴	پڑھ گئے	پڑ گئے
"	۱۷	رفتی	رُفتی
۱۲۱	۱۰	تشنہ یلیلا	تشنہ لبہا
"	۱۴	بکشم	بُکشتم
۱۲۳	۹	چاہ وپیار	چاہ پیار
۱۳۱	۶	وسانپ	دو سانپ
"	"	تھائے	کھائے
"	۱۷	باندھے ہو	باندھے رہو

۱۴۵	۱۱	تحقق	تحقیق
"	۱۲	نشنزیہ	نشتریہ
"	۱۶	کعبہ ونبر	کعبہ منبر
۱۴۷	۶	سکوسن	ساون
۱۴۸	۲	وہی حھلاسی کمر ہی کی نہیں	وہی چھلاسی کمر ہی کہ نہیں
"	۱۵	سنسان	سنسان
۱۴۹	۴	نگہ بار	نگہ یار
"	۱۶	فریادو	فریاد
۱۵۰	۳	اقی	باقی
۱۵۱	۱۷	آرادانہ	آزادانہ
۱۵۲	۱	منت ہستی کو کیا	منت ہستی کیا
"	۶	کہ یہ	کہ یہ
"	۱۵	تو یہ	تو یہ
"	۱۶	اوا سمجھوے	ادا سمجھائے
"	۱۷	متجب	تعجب
"	"	تھر	پتھر
۱۵۴	۷	وہ ہر سو	کہ ہر سو

۱۵۵	۱۵	ہی ہی	رہی ہی
۱۵۶	۱۷	عبرت سے	ذرا عبرت سے
۱۵۷	۱	چیڑہتے	چڑھتے
۱۶۱	۲	درو گوہر	زر و گوہر
"	۶	ہونکہ	ہوں کہ
"	۸	ٹہراے	ٹھہرائے
۱۶۳	۵	درویش وعی	درویش و غنی
۱۶۴	۵	ھربدہ	عربدہ
۱۶۵	۸	ہوگہ	ہوگھر
۱۶۶	۳	مضر	مضر نہیں
۱۶۸	۱	ہلال برق	ہلال و برق
"	۱۱	ریک	ریگ
۱۷۲	۳	سبزش	بہ بزمش
"	۱۵	میرے	میں ہے
۱۷۶	۱۵	یہی	یہی
۱۷۸	۱۶	خیر بھی سے	خبر بھی ہے
۱۷۹	۱۱	دور سے	درو سے

۱۸۱	۱۱	رضع	رضیع
"	۱۴	میتزمانے	میسانے
۱۸۵	۲	تری	تیرے
۱۸۷	۱	دود آہ	دود آہ
"	۱۱	توڑتا	توڑنا
۱۸۸	۱۶	وہ	جو
۱۹۱	۶	حبص بیص	حیص بیص
"	۹	ہوئے	ہوائے
۱۹۲	۴	آزاد بھی	آزاد ابھی
۱۹۳	۱۶	کی مسافت	کی بھی مسافت
۱۹۵	۳	سدیرو خوزلق	سدیرو خورنق
۲۰۰	۸	نگھ	نگہ
۲۰۵	۱۵	تیغ نو	تیغ تو
۲۰۹	۵	دمبالہ دار	دمبالہ دار
"	۱۰	بھی ہیں نشہ	بھی نشہ
"	۱۱	سلمنا	سامنا
۲۱۳	۱۰	نچلے	بچائے

۲۱۴	۴	فراوانی	سلیمانی
۲۱۷	۱۶	مٹنے	ہٹنے
۲۱۸	۱۲	خودنمائی ہے کا	خودنمائی کا ہے
"	۱۶	نمائش سے	نمائش ہے
۲۲۶	۱	دے کہ	دے کر
۲۲۸	۱	صدااالٹی	صداالٹی
۲۳۰	۹	چشم بز	چشم تر
۲۳۸	۸	کرہ	مگر
۲۳۹	۹	داو	داد لو
۲۴۴	۷	کرٹیں	کروٹیں
"	۸	لذت	صوت
۲۴۵	۱۷	مثل	مثل رقیب
۲۴۷	۷	لدورت	کدورت
۲۴۸	۹	سحرے	سجہ ہے
"	۱۳	نسر	سحر
۲۴۹	۳	کیا	کیسا
"	۸	وہ	جو

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴۹	۱۶	ستوں	کشتوں
"	۱۷	ہمیں	کہیں
۲۵۱	۳	چاکر	چاہ کر
۲۵۶	۱۰	شک	سنگ
"	۱۶	شک	اشک
۲۵۷	۹	تو	کو
۲۵۹	۱۵	اونگلیاں	اونگلیاں
۲۶۰	۵	پلنی	پلٹنے
۲۶۳	۱۰	دیکھی ہے	دیکھی جو ہے
۲۶۴	۱۳	حسن	حُسن
۲۶۵	۱۰	دل کو دہر	دل کو کہ دہر
۲۶۷	۱	بھی	ہی
۲۶۸	۴	سائگیتن	ساتگیں
۲۷۲	۱۷	سیہ کاری	جفا کاری
۲۷۳	۲	سازی	ساری
"	۴	فلاف	لاف
"	۱۰	تراز	ساز

۲۷۳	۱۲	بیش	پیش
۲۷۶	۱۷	گردباداوھ	گردباداوٹھ
۲۷۷	۶	کی	کو
"	۹	ولہ	قطعہ
"	۱۴	زمبیں	زمینیں
"	۱۷	نیساں	نیستاں
۲۷۸	۱	۲۱۰ ۲۵	۲۱۰—ولہ—۲۵
۲۷۹	۹	جائے	جائیں
۲۸۱	۱۷	رنکھے	رکھے
۲۸۳	۱۷	بہتسے	بہت سے
۲۸۴	۶	اُس یہ	اُس پہ
"	۱۷	ہے	تھے
۲۸۶	۱	۲۱۴ ۱۳	۲۱۴—ولہ—۱۳
۲۸۷	۲	کہ ناصح	کہ کیوں ناصح
"	۵	کا	کو
"	۱۷	تعنش	نقش
۲۸۹	۱	۲۱۶ ۱۳	۲۱۶—ولہ—۱۳

۲۸۹	۱۷	کہا	کیا
〃	〃	ہنستا ہے پر اوپر سے	ہنستا ہے اوپر سے
۲۹۰	۱۱	متک	مہ تک
۲۹۱	۶	گتر	گر
〃	۱۱	اننا ہو	اتنا تو
۳۰۰	۱۶	شوحی	شوخی
۳۰۵	۱۱	گلہ	گلا
۳۰۷	۸	پرواز	پرواز
〃	۱۴	دل بہ یار	دل بیمار
۳۱۲	۵	مشل	محفل
۳۱۷	۱۵	طبتم اخذتم علیہا اصری	لِبثتم اَخذتم علیہا اِصری

مطبع انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس